



يَا حَمْدُ

فتورت الترشّاب

سازمان اسناد و کتابخانه ملی

۱۳۹۰

قدرت اللہ شہاب

یا خدا

ترتیب

اس کہانی کی کہانی

جز قدرت اندھشابت نے خاص اس ایڈیشن کے لیے لکھی ہے

ربُّ الْمَشْرِقَيْنَ

تری دنیا میں مخلوم دمحورہ

ربُّ الْمَغْرِبَيْنَ

ہری دنیا میں تیری پادشاہی

ربُّ الْعَالَمَيْنَ

مجھے ننگر جاں گیوں جو جاں تیراہے یا میرا

جنہا جریں کے نام
جو ابھی بقیہ ہے حیات میں
یکن تم ان کی زندگی کا شور نہیں رکھتے

اس کہانی کی کہانی

ستمبر، ۱۹۴۲ کا میں تھا اور ہندوستان سے رُٹ پٹ کر آنے والے مجرود
کافروں کا نام بسنا ہوا تھا ہر چلے آگئے تھے وہ بعد میں آنے والوں کے
انتشار میں ہزاروں کی تعداد میں واگہ بارڈ پر کھڑے رہتے تھے۔ کسی کی
ماں، کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا بیٹا، واگہ پار کی بے کران پہنائی میں گم
تھا۔ اکثر کایہ انتشار موہرم شابت ہوتا۔ بعضوں کو فقط اپنے پایروں کے جانگڑا
انجم کی خبر ملتی۔ کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے کہ خستہ دخواب عزیزوں کو پایتھے
تھے یکن کم۔ یاوس و نامراد منتظرین کے چہروں کی خستگی دیکھتے کی ہوتی تھی۔
میں بھی انتشار کرنے والوں میں تھا۔ اپنے چپا زاد بھائی نعمت اللہ شاہ ش Abbott
کا انتشار کرتے کرتے میری آنکھیں چھرا گئی تھیں نعمت اللہ میرا چپا زاد بھائی

ہی تھا، نگوٹا دوست بھی تھا جس کے ساتھ چکور کے سکول میں میں نے کیا کیا
وھو میں نہ مچائی تھیں۔ اب وہ ایک دیہاتی سکول میں انگریزی کام اسٹر تھا اور
اپنی سبک نین نقشے والی بیوی کے ہمراہ کہیں بچھڑ کے رہ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا
کشوں میں شامل ہو گیا تھا یا کسی کیمپ میں پڑا ایڑاں رکھ رہا تھا، مجھے کچھ خبر
نہ تھی۔ بہر حال مجھے اس کا انتصار تھا۔ یہ آس کا رشتہ بھی خوب ہے۔ ٹوٹ کر بھی
ہیں ٹوٹتا۔ آخر وہ ایک روز آیا، میکن میں اسے نہ پہچانا۔ لوگوں کو متوجہ کیتا
ہوا میں اس کے پاس سے دو تین پار گز رگیا، آخر اس نے خود مجھے قدرت کہ
کے آواز دی۔

یہ نعمت افسد کرنی اور تھلاس میں نکھل البیلے جوان کی جگہ ایک صدیوں کا مادہ
ہڈیوں کا ڈھانچے بیاس خون آور، پھرہ غبار آور۔ میں نے پوچھا۔ ”نعمت؟“ جوابی
کہا ہے۔ ”وہ رو دیا اور اپنے پاس مبھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت
کو چھڑہ داغ داغ تھا۔ صیبح چھر سے کی کھال جیسے جستی ہوتی آہستی سلانخون سے
دارخ دی ہوتی ہو۔ ہوا بھی ہی تھا، اس بہت اور غیرت والی خاتون نے اپنا پھر خود
دا فاتحہ کا کیمپ میں آئے دلے شکاریوں کی نظر میں سے محفوظ رہتے۔ وہ چھڑہ
نہ دافتی تو اس وقت واگ کے اس پار نہ ہوتی اور اب تک غاباً اس کا سارا جسم
دغ چکا ہوتا۔ — نعمت افسد کا یہ عالم اس طرح ہوا کہ چند سوراوں نے کیمپ
کے کنوئیں میں نیلا تھو تھا گھر دیا تھا۔ بعضے اس آبیحیات کرپی کر کیمپ میں زندہ

جادید ہو گئے، نعمت اللہ ان میں سے تھا جن کی آئتیں اس مشروب سے کٹ کر رہ لئیں۔ نعمت اللہ اسی روز — اس ارضِ مورود میں پختے لے چکنے بعد بار چیاتِ امداد کر سکا رہا۔ وہ عقیفہ، اس کی جیوی تیسرے روز پہلی بسی اور میں جو اتنے دنوں سے منتظر تھا، خالی ہاتھ کراچی واپس آگیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لا رنس روڈ کے ایک بُنگھے میں رہتا تھا رات بھراں کی روشنیاں جلتی رہیں اور رات بھر میں بیٹھا یہ کمانی لگتا رہا، نعمت اللہ کی لہانی — اپنے لاکاؤن چمکر کر کمانی۔ اپنے لاکاؤن کے علاوی بخشش کی بیٹی دشادوں کی کمانی۔ کیپروں کا حال جو میں نے تھا جب تھا، لاہور میں دیکھیں۔ جما جرہینوں کا شکار کرنے والے بہت سے بھائیں جن کے چہرے یا خدا میں نظر آئیں گے، مولوی نہادم خلق، قوم کے یئر اور سیاست دان، سمجھی اصلی کروار میں میں نے انہی کے نام نہیں لکھے۔ ان میں ایک صاحب کو تو خدا نے ذریمِ محکمت بھی بنایا۔ خدا بھے چاہے جو عزت دے دے اس کی مصلحتیں وہی جانتے۔

اس کمانی لا انعام بھی میرے ذہن نے نہیں سوچا۔ اسے میری لگنگار آنکھوں نے کراچی کے عدالتگاہ میدان میں دیکھا جاں بے خانہ نوں نے دیرے ڈال رکھتے ہے یہیں دشاد، یا اس نام کی خوریں مجھے پکوڑ سے تلتی، سچتی نظر آئیں۔ ساتھ دالی سے کما، بہن ذرا میرے بچے کا دھیان رکھنا، میں میں نے آؤں۔ اور کسی کے ساتھ میں لینے پہلے دین، یہ پکوڑ سے برسوں تھے جاتے رہے اور پکتے رہے، شاید اب بھی ان

ہیں سے باقی ہوں۔ یہ بچے اب تیرہ چودہ برس کے جو شار قلیٰ، مزدُور یا بھک ملنے
اس ارضِ موعود کے شہروں میں شامل ہیں۔

۱۹۲۶ء، ابھی ختم نہیں ہوا۔

اس کتابی کی کتابی بھی ختم نہیں ہوا۔

گراجی کے بعد میر انقرہ لاہور میں محلہ صفت کے ڈائرکٹر کے طور پر ہوا۔
ایک روز ڈاک میں ایک چھاپر اپنا سیلان فلم بھیج گئے۔ سواد تحریر قلعی طور پر اپنی تھا۔
میں نے کھولائی۔ ایک لڑکی کی داستان تھی جو یک دنہا بے یار و ملوگا را چھوڑ کے قریب
جماعون کی جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اس نے لکھا کہ میرا جسم داغاں لیکن میں اس پر
پہنچ گئی۔ یہ دھرتی میر سے یہے فردوس کی سرزین اور یہاں کا ہر مسلمان مجھے شفیق بھائی
دھکائی دیتا تھا لیکن یہ بھائی ہوتا کہ شکاری بن گئے۔ انھوں نے میری جو خاطر و عذالت
کی ہے، اس کے طفیل اب میں تپ دن کی مریض ہوں اور میر سے بہت دن باقی میں
تحوڑا پڑھی لکھی ہوں۔ یا خدا کیس سے مل گئی میں نے پڑھی مجھے یہ کہا ہے کہ میں
دشاد بن کر بھی دشاد بن سکی۔ میں ان محصور دن میں سے ہوں جو مبہی خوشی پکجوئے
نہیں کل سکتیں۔ میں یہیں لا ہسکتیں اور اس پاک سرزین میں سینکڑوں سا شاید
ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

میر سے پاس ایک لمبی سی شوریٰ سیت کا تھی۔ ان دنوں اس کی قیمت سستی اور

شان تریادہ تھی اسے میں نہ ان جھوٹپڑیں سئے کوئ مردگ پر چھوڑا ، اور
لپت پھاٹا جونہ نا ایک بات کی تعلیمیں پہنچا دیاں ایک ریزان الگھوں والیں
بیٹھے کیسے کھروں ہیں جیوس بیٹھی تھی۔ لڑکی کیا تھی ماکو یہ دھیر پا جو بندگی کے سزا
— لگ لے؟ اگل بستے کارروائی روایت ہوا۔

دستے میں کوئی نیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ ایک بار اس لڑکی سے بھی آدھ بھری
اور کہا شاپ ہنا حب۔ میں اسی سلسلہ تریادہ بین اور ملیل کارروائیں صوالہ جو بھی جیں
جن وقوں میان کیمپ میں تھی اور انھی کارروائیں میں وہ پس کیمپ پہنچ جائی تھی۔
ہم لڑکی کا خلاج ہو گیا۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی مل گی اور تھوڑا پست
روزگی کا دیلہ بھی جو گیا اور میرے ذہن میں رانہ نکل گیا اور میں ایک بار پھر کرچی
میں ایک توکری پر ٹلانا گی۔

ایک روز میرے چڑپا اسی سخے یک کافر کا پنڈہ کر دیا گر، ایک صاحب آپ
سے دن چاہتے ہیں اُن کے ساتھ ایک بر قدیم پوش خاتون بھی ہیں۔ ہم ان صاحب کا
میرے سیلہ اپنی تھے۔ میں نے انھوں انہم بھلیا اور کہا مفاتیح یکجنتے میں آپ کو چھاننا
ہیں۔ ای صاحب نے سکراکر اس بر قدر پوش خاتون کی طرف اشارہ گیا جس سخے
اب فرما پلت دیتا تھا۔ ایک پستی نگذ کی شد رسانہ خاتون تھی۔ اس سخے کا میں
اچھوڑ کی تھیں۔ رہنمہ والی دشادھوں بزرگ دشادھوں بین عکی میرے میان ہیں۔ اور

میں آپ کا شکریہ ادا کرنے سے آئی جوں کیونکہ میں پھر زندگی میں ہوں۔
 رست کوئی توں میرے ہاں بخانہ پر آتے۔ دوسرا سے روز پھر دس کو دوڑا بادی ہیں
 تم ہو گئے اور اس پر کئی سال گز رگئے۔

چھپے دنوں — ابھی چند نہ پہلے کی بات ہے میں صدر پاکت ان کے ہمراہ
 مشرق و سفی کے درسے کی ایک منزلہ ہزار میں اتر۔ یہ تسلیماً کا مرکز ہے اور امریکہ کا
 ایسا ہم نوجی اور یہاں حسبِ رسم چاراً تعداد متفاہی عمدہ داروں اور مزدہوں سے
 کریا گی۔ انہی میں ایک صاحب پاک لی تھے، ریشمی صافہ بام سے ہوتے، انہوں نے کہا
 شہاب صاحب آپ بھے چھاپنے؟ میں نادم ہوا تو بوسے میں آپ سے کہا گی میں
 طاقت اور یہ میری بیوی ہیں۔ انھیں آپ بھج سے زیادہ جانتے ہیں۔

یہ دہی خاتون تھی لیکن اب پچالی تینیں جاتی تھی جس سے پر جوانی کے علاوہ جراثی
 کی آسودگی اور غمینیت کا تو رنجھا اس سبب تھا کہ اب جمارا تین سال کا ایک بچہ بھی ہے۔
 اس کتاب کے لئے جانے کے چودہ سال بعد مجھے یعنی ہو گی کہ موت کے بعد
 تو نہیں البتہ اس ارفی زندگی میں آں گوں کا چکر مزدروں پر چھاپے۔ زندہ انسان آخری
 موت سے پہلے کئی مرتبہ مرتا اور کئی بار تیا جنم لیتا ہے۔

کشگان خبیر تسلیم رہ ہزار از غیب جانے دیگر است
 جب میں دشادی کی زندگی کو مخالفانہ تھیت دل کے پٹا سے کے ساتھ تو نہ ہوں بچا سکے۔

پرچمیں تو مجھے ہی زندگی بخاری نظر آئی ہے۔ بہت لوگ اس کتاب کے چھپنے پر مجھے ناخوش
ہو رہے اور مجھے بہت سے لمحن سننے پڑے یعنی اس روشن بیشائش اور صیغح پھرے
کے مقابلے میں جو مجھے دبیران میں نظر آیا ان کی حقیقت ہے اگرچہ اس نتیجے کو بھی
میں غصمنی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو فقط اپنے ارجنی نعمت انساد اور اس کی بیک پڑھ بیوی
کی کہانی لکھنی تھی جن کے انتخارات میں میں ہفتون و ہفتون کے بار بذر پر کھڑا رہا۔ اور جن کی
کل قلاش میں میں نے دہ سب کچھ دیکھا جو میرزا کو کشش کے باوجود دبھی میرا قلم پر مدعا
حرج لکھنے سے فاصلہ رکھا۔

قدرت احمد شاہ

یکم ستمبر ۱۹۴۱ء

رَبُّ الْمَشْرِقِينَ

تَرَیِ دُنیا میں میں مُحکوم و مجبور

”اس طرف کی تکمیل ہے سالی؟ تیر کوئی خصم ہے اور ہر؟“

امیکیٹ نے کرپاں کی نوک سے دشاد کی پسیوں کو گد گذا�ا، اور
بایاں گاں کھینچ کر اُس کا منہ بچھم سے پورب کی طرف گھنعا دیا۔

دشاد مسکرا دی۔ یہ مسکراہست اس کا خاصہ بن گئی تھی۔ بچپن میں اس
کا کہا میا ب ترین ہتھیار اس کا رونا تھا۔ ایک درا سی رین رین، ران ماں کر
کے دہ ماں کے یعنی میں چھپاتے ہوئے دودھ سے سے سے گرما رہی میں رکھی
ہوئی برلن تک ہر چیز کو حاصل کریا کرتی تھی۔ اب جوانی نے اس کی مسکراہست
میں اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہوا جب اس کی

یاخدا

ایک مسلمان ہمٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھانی تھی کہ اگر چاند یا سونہ بھی یا
تماز سے بھی اُسے اٹھائے جائیں تو وہ ارض و سماں کی وسعتیں پچاند کر
اسے چھین لائے گا۔

رحیم خاں جھوٹا تھا۔ مکار گئیں کہ۔ آسانوں کی بات تو دُور کی بات تھی
وہ تو اسے زمین ہی پر کھو بیٹھا۔ دشاد نظر بچا پا کر قبڑ رو ہو بیٹھتی تھی اور
خال ہی خال میں اپنی جبیں کو اس آستانے پر جھکا دیا کرتی تھی، جس کے
دامن میں رحمتوں اور نعمتوں کی ایک بے کران دنیا پوشیدہ بنائی جاتی تھی۔
مغرب کی طرف کعید تھا۔ کعبہ اللہ میان کا اپنا گھر تھا۔ اس گھر کا تھبور دشاد
کے دل میں عقیدت اور امید کا ایک تانبک چراغ روشن کر دیتا تھا۔ یہیں
امریک سنگوں کو پھم سے بے حد چڑھتی۔ یوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چمنہ
رہا تھا بڑے ڈیرٹھے تھے؛ ایک کر یا دو سرے نیم چڑھا۔ بارہ سے بارہ بجے
تک اُن کے اعصاب لکان کی طرح تنسے رہتے تھے اور یوں محلوم ہوتا تھا
گویا کسی نے بستی بھر کے بچوں جوانوں اور بُڑھوں کو حبسی کے تاریں
پڑ کر برقا دیا ہے۔

امریک سنگوں کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن

رب المشرقین

یہ ایک بھی انک سادا ہمہ پر درشنا پارتا تھا۔ کوئی بھر میں یہ بات پہلی ری
تھی کہ سر شام ہی مسجد کے گنڈی سے عجیب عجیب ڈرائی آوازیں تالی
دیتے گئے ہیں ————— جیسے دو چار بجریوں کو بیک دلت
ذیع کیا جاسا ہو۔

• سالِ حرامی "امریکی سنگوں کا کرتا تھا" مرتبے کے بعد جبی ذکر ادا
ہے، بھیلیے کی طرح، قابل دوچھوڑ کرے کوڑے کے گنوں میں "•
اڑے چڑو بھیں" امریکی سنگوں کا بھائی ترلوں سنگوں ماق اڑاتا
تھا" بانگ دے رہا ہے مٹا بانگ" •

خالصہ جبی کے راج میں دھرم کی پوری پوری آزادی ہے۔ ۱۱"•
یہی نی دربار سنگوں جبرئیل پھاڑ کر ہنستا۔

یکن امریکی سنگوں کی جویی ڈرتی تھی، رات کو نائمے میں جب مسجد کا
گتوں ان گل پھاڑ کر چل گا رہتا، تو اس کا ان بدن ٹھنڈے لپیٹے میں شراب
ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماعلی بخش کی تصویر آ جاتی، جو مسجد کے
محرے میں رہا کرتا تھا، سیخعت بدن، دو ناخن کی لبی دار ہی آنکھوں پر
ہوتے گلاس کا چشمہ صرف پسیں مل کی پے ذہب سی گلزاری ناخوں میں رعشہ

گردن میں ابھری ہوتی رہیں۔ میکن جب وہ صحن میں ٹھرا ہو کے پانچ وقت
اذان دیتا تو مسجد کے گنبد گونج اٹھتے اور علی بنیش کے نیجفت و ندھال لگے
سے وہ زنائے کی آواز نکلتی جیسے بہت سی آیات دست بدایاں ہو کر
گونج رہی ہوں۔

اذان کی آواز سے امریکہ شکھ کی بیوی کو بڑی کوئت ہوتی تھی ایک
 وقت یاد و وقت کی بات ہوتی تو خیر، میکن جب دن بھر میں پانچ بار اُسے
 یہی ہول سننا پڑتے تو وہ گھبرا جاتا۔ اس نے بڑے بڑے ہزار گون سے سن رکھا تھا
 کہ اذان میں کافے جادو کے ہول ہوتے ہیں اور جوان غور میں اُسے سُن کر
 باہمی جاتی ہیں اگر بن بیا ہی تو خیز لڑکی باہمی جاتے تو اس کے باخچہ ہونے
 کا ڈر تھا۔ اگر بیا ہی ہوئی بیوی باہمی جلتے تو اس کے عمل گرنے لگتے تھے
 پانچھہ امریکہ شکھ کے گھر میں پشتہاپشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر اذان کی
 آواز فضا میں لہرائی ادھر کسی نے کوئرے کو چھپے سے بجانا شروع کیا۔ کسی
 نے چھپے کو تو سے سے رہا۔ کوئی لاڑکان میں انگلیاں ٹھوٹس کر میشیں گئیں کوئی
 چال کر بھلی کو ٹھری میں جا گئی ————— اور اس طرح بہادر
 خاندان اپنی لاڑکان کی کوکھ کہ کہے جادو کے اثر سے بچا کر ہرا بھرا

درستہ آیا تھا۔

امریکہ نگوں کی جیوی کے بھن میں سوا لاکھ خالصے پروردش پا رہتے تھے۔ سکھوں کی لگنے ہیں ایک سلسلہ سوا لاکھ اندازوں کے براپر شمار ہوتا تھا۔ اتحادیات گئے جب سید رامکrishna امریکہ نگوں کی جیوی کے تھوڑے میں بھیساںک اور جنماںک گورجی بن کر دکھاتا تو اس کے پیٹ میں خالصوں کی چیزیں اور فوج ہڑپونگ پہنچنے لگتی۔ کبھی اس کے لافوں میں کنوں کی چنگھائیں جگر خراشیں امداد سے گوئیں۔ کبھی اس کے تھوڑے میں کنیلیں کا دہاٹ جھوڑ سے چھاڑ کر اس کی طرف پہنچتا اور سرد قلت اسے یہ درھڑ کا صانکار جانا کہ حال علی ہنر کنوں کی دیوار کے ساتھ دریٹھتا ہوا باہر نکل رہا۔ اور چشم نہ دن میں کنوں کی منظر پر کھڑا ہو کر رہ جانے کی دلت اسے "بانگ" کے دکھ دے گا۔

امریکہ نگوں کی بھن کے بھن میں تو ایسی کس خالصے نے اپنا گھر تھیں جایا تھا۔ یکر نگوں ایکی دہ ہیں بیا ہی تھیں لیکن اس کے دل پر سوا لاکھ کا قبضہ اتحادیات کو جب وہ اپنی چاہ پاپی پر فرمیتے کردن میٹھی میٹھی لگدگریوں کو یاد کرتی ہو ملکی کے گھیتوں کی ادھ میں سوا لاکھوں کی جبوکی انگلیاں اس کے

تن بدن کو حصہ نہیں تو اس کے سینے میں ارمانوں کا ایک جوہم سما
اگر آتا اور وہ تصور ہی تصور میں اپنے جسم کو جوان جوان تو ہی قومی خالصوں
کے دخود سے آباد کریتی ————— سین پھر مسجد والے کنوں کی
دلدوز چلپاڑا اس کے ایوان تصور کو مسکار کر کے رکھ دیتی اور معاں مس
ہوتا کہ کنوں کی عین گمراہ سے بھی طالعی بخش کا کے جادو کے بول پکار پکار کر
اس کے پیٹ سے چینے والی نسلوں کے نمکے بند کر رہا ہے۔

امریکی شیخ کو اپنی بیوی اور بین دونوں پر غصہ آتا تھا۔ بزدل کی بچایاں
طالعی بخش ترکب سے دُور دفان ہو چکا تھا۔ جس روز دو کنوں کی منڈیر
پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ امریکی شیخ نے خود اسے تپرے کی نوک پر اچھا لاء
تروک سنگھنے اُس کو اپنی قوار پر آزمایا، گیانی دبایا سنگھنے اُس کے
جسم بھاتے ہوئے غریب اُدوں سے کنوں میں پینٹک ٹالا۔

ایک طالعی بخش ہی پر کی مختصر تھا۔ اب تو پھر کار سارا گاؤں حادث ہو
پکا تھا۔ باعُین دیستہ اور سنتے والوں کا دخود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بجاں گئے
تھے، کچھ مر گئے تھے اور بہتوں کی گردان پر خالصوں کی مقدس کرپائیں کہہ
ریز ہو چلی تھیں ————— سین یہ ذرا پوک عرام زادیاں تھیں کہ اب بھی وہی بانگوں

کے ڈرس سے اپنے بچوں والوں کو چھاتے چھاٹے بھرتی تھیں۔ چانپ جب لے رکی ٹکھے
کی بیوی اور بین سوتے سوتے پیخ کر چاہیاں پینے لگتیں تو اس کا دل ٹیکش
ہے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ چٹا اٹھا کر اٹھیں مار مار کر ہو ہمان کر دیتا۔
ہارتے ہارتے اس کے ہاتھ شش ہو جاتے، بازوں میں تھکن آجائی، رگیں
پھول جاتیں اور وہ اپنی گنجان داری سے پینے کے قطروں کو جھاڑتا
ہوا دیوانوں کی طرح پک کر دشاد کے پاس چلا جاتا۔ جس طرح دامنِ زکام
کا مریض دماغ کی بیزش کو ہلکا کرنے کے لیے دقا فرقا سوار ہوئے
یا کرتا ہے، اسی طرح لگادس بھرے خاصے اپنی دھم آؤ دیویوں ۲۰ در
ہمنوں سے بجاگ کر اپنے بدنا کا فشارِ خون دھیما کرنے کے لیے دشاد
کے پاس پہنچے جایا کرتے تھے۔

دشاد کو مسجد میں رکن گیا تھا کیونکہ جھرے کی چھت جل جلا کر گز
چل تھی۔ یوں تو اس کے سرما نے میں جسم بھی تھا اور جان بھی۔ لیکن اس کا
عزم نہ تھا میرا یہ اس کے آپا کی تیزی تھی۔ ملا علی بخش کے اتحاد اسی تیزی پر
محوتے گھوٹتے بوڑھے ہو گئے تھے۔ پھر کے گول گول والوں پر اس کی
انجیکوں کے نشان نقش فرمادی کی طرح پورستہ تھے۔ سالما سال کے گزی

نیم بھی اور نفت ان سحری کے آنسو اس تیسیع میں متینوں کی طرح پرستے ہوتے تھے۔ یہی چند موڑ تھے جن کے وجود سے دشاد کا شاہزادہ اسٹاف ابھی تک آباد تھا ————— وہ دن بھر اس تیسیع کو مجھے میں ڈال کر قیف کی پیچے چھپاتے رکھتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی دیران کرنے میں بادلتی تھی، لیکن اُسے در تھا کہ کیس بھگ اور شراب میں سبوئی ہوئی زبانیں اس کے ابا کی انگلیوں کے لفڑوں کو بھی چاٹ چاٹ کرنا پاک نہ کریں، آدمی آدمی رات گئے دہ مسجد دائی کنویں کی منڈیر پر روایا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں کنویں میں ڈھنگل گائے پک جاتی تھیں کہٹا یہ کبھی اس کے ابا کی تیرتی ہوئی پچھوئی کی ایک جملک اُسے دکھائی دے، اس کے کان کنویں کی طرف لگئے تھے کہ شاید کبھی اس کے ابا کی آفری سسلی اُسے ایک بار پھر سانچی دے یادہ خوناک چکنیاں جنگوں نے لاویں بھر کی خود توں کو پر پڑان کر رکھا تھا، شاید اس کے منتظر کانوں کو بھی فوازیں ————— میلن کنوں تاریک تھا اور قبر کی طرح خاموش — جب کوئی آوارہ چمگا ڈر اس میں پر پھر پھر اپنی تو۔ ہر پھر پھر ابھی کے ساتھ بدبو اور تعفن کے تیز تیز بھیکے فضا میں منتشر ہو جاتے

تھے۔ یونہج سوا لاکھ بیادر دوں نے عالمی بخش کا گلامرنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لیے گزیں کو غلط اور کوڑے کر کٹ سے اٹاٹ بھردیا تھا۔
 دشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہوئے تامے کی طرح تھا کہ جس کے ٹوڑے آسمان کے دیناروں میں ایک ہی ایک بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط ٹوٹ چکی تھی۔ سورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بخود گئے تھے اور وہ ایکلی رہ گئی تھی۔ بے یار دہدار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ مغلی ہوتی۔ سبھی ہوتی۔ گھرائی ہوتی۔ حیران۔۔۔۔۔ یہن اس کے دم سے مسجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باشہد باندھ کر داں آتے تھے اور دشاد وہ بیادر خالصے محاب کے نیچے مجھ کر شراب کا ادھیا کھوتے اور دشاد کی بوڑیوں کو چوڑ پھوڑ کر لختے کی کوشش کرتے تو گویا اعین یہ فخر ہوتا کہ وہ گن گن کر سارے تیرہ سو برس کی اذانوں اور غازوں کا بدلہ چکار ہے ہیں۔
 چکور کی مسجد گور دهاروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیاہی ہوتی اور بن بیاہی ماڈوں کو یہ احساس تانتے لگا کہ عالمی بخش کے بعد عالمی بخش کی بیٹی ان کی کو کھو لئتے پہلی ہوتی ہے۔ وہ تو پھر کھا کھا کر اپنی چار پاتیوں سے لگ کر سوچاتی تھیں یہن ان کے بیادر خالصے رات

رات بھروساد کے ساتھ پہن آئے دلی نسلوں کا سودا یک کرتے تھے۔
 امریکی سنگھ، امریکی سنگھ کا باپ۔ امریکی سنگھ کا بھائی۔ —
 ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ، دوسرا سے خالصے کے بعد تیسرا خالصہ
 رات بھروسہ نظریں بچا بچا کر، موقد جانچ جانچ کر
 مسجد کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ جتنی ہوئی تیکھی اور گردے اُدستے۔
 تئے ہوتے گا بون کا ذور چلتا۔ شراب او۔ بھنگ کی بائیں بیٹیں اور اپنی
 نسل بندی کے دو یقین جن کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے ان کی بیویاں نہ نہ فرج
 کے جتن کرتی تھیں، وہ بلا دینے مسجد کی چار دیواری ہیں بھیر آتے۔ —
 اور ایک دن بیٹھے بھاتے یکایک دشادسرسوں کی فرج پھول، بھی۔
 جب یہ خبر پہلی تو گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ بیویوں نے چیخ پیچ کر اپنا سر
 پیٹیا۔ کنوواری رہائیوں نے رو رو کر آئیں سُجاییں اور مکنی کے کھیتوں
 میں چھپ چھپ کر اپنے نسلوں سے مٹھوڑ دیا۔ کنیزیں کی چلکڑیں تیز تر
 ہونے لگیں۔ گھروں میں قٹ پر قٹ آنے لگے۔ چھٹے پر چھٹے چلنے لگے،
 ایک کھرام سا پیچ گیا۔

پسلے تو سب کی یہ راستے ہوئے کہ بچپہ پیدا ہونے سے پسلے ہی دشاد

کو ہار کے سوئیں میں پھینک دیا جاتے۔ لیکن پھر امریک شکھ کو ایک مفہوم
تجویز سوچی۔ آم کے آتم لکھنیوں کے دام۔ ایک روز مجھ سویرے وہ
ا سے اپنی بیل لگاؤ ہی پر بجا کے پس کے تھام میں سے گیا اور اغوا شدہ مہمان
عورتوں کی برآمدی نے سملہ میں اپنی کوششوں کا عملی ثبوت دینے کے لیے
دلشاد کو پیش کر دیا۔

تحانید انجورام نے امریک شکھ کی کارگزاریوں کو خوب سراہ۔
پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پروانہ اسے عطا کیا اور ڈپٹی مشتریہادر
ستے بھی سند دولت کا عددہ فرمایا — پر تحانید احباب
نے یعنیک اٹھ کر دلشاد کا جائزہ بیا۔ قبول صورت اجوان ذرا پیلی سی لینک
گرم گرم، گذرا — لیکن جب ان کی نفر دلشاد کے
پیٹ پر پڑی۔ تو ان کی بھروسی ہوئی ایسہ دل کو ایک زبردست دھکہ
لگا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اگر دس بیس دن کی بات ہو تو وہ اسے بھی
تھام بھی میں رکھ لیں۔ لیکن جب ہمیہ کافیں دریوں حسن سنگھ نے جوڑ
توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی "خلاص" ہونے میں تین سارے ہے تین میٹنے
بالی ہیں تو تحانید انجورام کو بڑی ہالیوسی ہوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا

گریب وہ ایک پتل سی بیان اور جائیں پن کرچا۔ پان پر لیٹے تو انہوں
نے دشاد کو پاؤں دباتے کے لیے پس پاس جایا۔ جاتے چوڑ کی شکوٹی ہی
ہیں۔ تھائیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پندیوں میں آئی
پھر لھٹوں میں۔ پھر انہوں کے اندر، پھر کوئوں کے آس پاس —
_____ اور دشاد کا اعف _____ مکار کر اپنی رُکھتی جوئیوں
کا درد رہاتے رہتے۔ تھائیدار صحور ام کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام
تسکین تھا۔ چنان ہوا تو کیا، چنیں ہوا تو کیا؟

دشاد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پچھلے چمنہ چینوں میں اس
نے زندگی کے ہیچ کچھ اس طرح محسوس تھے کہ اس کے بدن کی بوئی بول
غول امر ہم کا بجا بن کر رہ گئی تھی۔ جو کوئی اسے جان سے جی چاہتا رہا
یہا اور اس کے سبک کا ہر حصہ بھر کتے ہوئے ہانپتے ہوتے رہتے ہے چین
انہوں کو چمنہ ہی ہوں میں تسکین کا جام پل دیتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی
رُل رُل میں لکھنے پھر رہے تھے۔ لکھنے میں تھیں، لکھنے رہتے ہوئے زخم
تھے، بکش! رحیم خاں بتتا تو دیکھتا۔

دشاد کو پسے آپ پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس نے بیچا۔ سے رحیم خاں

دہلی شر قبیل

کو اپنی بارنا تھی، وو سس کیا تھا۔ ایک مرد جب اس نے اُسے نبردستی پومنے کی کوشش کی تھی تو دشادستے خصہ سے اس کے سر پر ایسا دو تہڑا مارا تھا کہ اُس کی چوریاں فوٹ کر ریسم خان کے ماتھے میں گز لگتی تھیں، اور وہ خود ساری رات انگاردن پر بوتی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسول ریسم خان کو اس لذاد کیا سزا دیں گے؟ بچا کر ریسم خان!

پندرہ میں دن کے بعد جب تھا تیناءں ابھوراہم کے گھسنوں اور کوہوں اور مکراہ درد و دراہم ہوا تو انہوں نے دشاد کو چھٹی دی اور ہمیہ کاشیں دریوں صنعتیوں کے ساتھ سے ابالم کیپ بیچ دیا ہی۔ اس نے اس نے ہمیڈ کا نسبیں دریوں میں شکوہ کے کوہوں اور گھسنوں میں بھی بھی بارہ درد اٹھا۔ لیکن دشاد بر تھی تندی سی سے اس کے درد کا کام اور کرتی گئی اور دس گھنٹے کی مسافت انہوں نے دس بارہ دنوں میں بھیر دیا۔

ابالم کیپ میں بہت سی رہائیں تھیں، بہت سی فوریں۔ جو ان بھی انہوں نے بھیر دیتیں۔ لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح کہ جن کے تسلیم بھج گئے ہوں، جن کی کھشان بٹ گئی ہو۔ جن کی انہوں نے پریخڑیں دیا گئی ہو۔ ہر روز فرج کے رُک آتے تھے، زر نمی میں مرطی کوں، نمی میں غور توں کوں

ابن الکیم پر می چھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدیس کی حیثیت کے یہ بھروسے ہوتے انہوں موقت چھرا پتے مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی ان پر اپنے " سبحان " اپنے " عفو الرحیم " اپنے پاک پور دلگار اپنے قادر مطلق کی حمد کا وفیضہ شروع نہ ہوا تھا۔ بلکہ کیمپ لمنڈر میں ہجرتیم سنگی اور اس کے جوانمرد سپاہی ابھی تک ان پر گرد کی بانی جدتے تھے۔ خیر دشاد کو اب ایک قسم کی چھٹی تھی۔ یوں تو نیک اولاد ہمیشہ اپنے ان پاپ کا سما رہوتی ہے لیکن دشاد کو اپنے ہوتے ہوئے دلے پسے پر بڑا ہی بھروسہ تھا کہ اس نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی مجسٹری ماں کو اپنی خاکہت میں سے رکھا تھا۔

ابن الکیم پر کے پسلوں میں ریلوے لائن تھی۔ سروج کی ردشتی میں ریل کی پڑیاں چاندی کے تار بن کر ہلکتی تھیں اور دُردست دوسری بُرت کی طرف ان کی نقرتی لڑیاں خوابوں کے سہانتے جزیروں میں گم ہو جاتی تھیں۔ ان جزیروں کے لئے اس پاس دونوں کی سرحد جنت کی سرحد سے ملتی تھی اور کیمپ کی عورتیں ریل کی پڑیوں کو چھوڑ چھوڑ کر سرشار ہو جاتی تھیں کہ ان کا رو سرا سر امشرقی چخا ب میں نہیں بخوبی پنجاب میں ہے بخوبی پنجاب !!

رب المشرقين

مغرب کا خیال آتے ہی دشاد کی راگھ میں ایک نحاسا چڑاغ نہیں اٹھتا۔
 مغرب میں کچھ ہے۔ کعبہ اللہ میان کا اپنا لآخر ہے۔ لیکن کیپ کی
 دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہاں چاہے
 بحالی ہیں، ہماری بیٹیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔ وہاں عزت ہے۔
 وہاں آرام ہے۔ دشاد سوچتی تھی کہ شاید وہاں حرم خان
 بھی ہو۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جسم کا روائیں روائیں تھلی اٹھتا اور وہ بے
 چین ہو جاتی کہ پر لگا کر اڑ جائے اور اپنے تھلے ہوتے دکھے ہوئے جسم
 پر اس ارض مقدس کی خاک ملے۔

چھتے، دوچھتے، مہینے، دو مہینے۔ دن گزرتے گئے۔
 دو میں بیتی گیں اور مغرب کا خوش آئند تغور دشاد کے بیٹے میں
 امیدوں کا قور پھیلاتا رہا۔ اب بالکل کیپ کی آبادی بڑھتی گئی اور جب میہر
 پر تم سنگھ اور اس کے جوانوں کا دل اچھی طرح سیر میگی تو ایک دن دہ
 ریل بھی آگئی جس کے انفصال میں امیدوں کے چڑاغ بھی تک جل ہے تھے
 جب دہ ریل کے دبے میں سوار ہوئی تو دشاد کو مل مل نہیں کیا دآئی وہ بھی
 اسی طرح ریل میں بیٹھ کر ج کو روائیں موتھا لگئے ہیں، ارتھے، کپڑوں پر عطر تھا اور

گاؤں کے لوگ باجا بجا تھے ہوتے اس کے ساتھ اسٹیشن مک آتے تھے۔

ریل کے ہر فرائی کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہوتے آجیئے جنہجنہاں
انھتے تھے۔ پیسوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور روح کا ایک
بلنگل جانا تھا۔ جب وہ کھڑکیوں سے جانک جھانک کرتا رکے گھبلوں کو
دیکھتیں جو بڑی صرعت کے ساتھ پچھے کی طرف بھاگ رہے ہوتے تو
انھیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔ زمین کا جو چھپے چھپے
ان کے پیٹھے سے نکلتا وہ انھیں مشرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب
کے قریب تر رہے جاتا۔ اگر کہیں لگاڑی رکتی تو ساری کائنات دم سادھ
لیتی۔ وقت کی رفتار ساقط ہو جاتی اور انھیں یہ ڈر لگتا کہ شاید انہن کے
سامنے، چانک بڑے بڑے پھاڑ آگئے ہیں۔ جب گاڑی دوبارہ چلتی تو
دل کی دھڑکنیں جاگ اٹھتیں، سینیوں کے ارمان تمازہ ہو جاتے اور وہ کھڑی
سے اتھر باہر نکال نکال کر اس ہوا کو چھوٹے کی کوشش لرتیں جو مغرب
کی سمت سے آ رہی تھی!

لہچاٹ، پلور، جالندھر۔ — امرتسر — ہر

رب المشرقین

منزل پر عورتوں کی زندگی کے بند کھتلتے گئے۔ ان کی خاک میں سوتے ہوتے نظرے
بیدار ہوتے گئے۔ وہ لکھنے لگیں۔ وہ مسکاتے لگیں۔ وہ آنکھیں مل مل کر
ایک دوسرے کو دیکھتے لگیں۔ جیسے کسی بھی ایک خواب کو بھلا کنے کے
لوگوں کو اپنے ہیں۔ کسی نے باوس میں کشکھی کی۔ کسی نے دو پڑے کے
ساتھ دانتوں کی میل آثاری۔ کوئی کپڑے جھاڑنے لگی۔ کوئی بچوں کو دریاں
شانے لگی۔ کچھ عورتوں نے سر سے سروڑ کر گیت گائے۔ پایے پایے
رس بھر سے دربار گیت، کہ ”اے کالی کملی دلے میں تیری یہ رب نگری
میں آئی ہوں۔۔۔“ مجھے اپنی لکلی میں چھپا۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک
پناہے

جب کاؤڑی امرتسر کے ایٹھن سے نکلی تو کسی نے کہ اب صرف
ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر اور ہے۔ میں ڈیڑھ گھنٹہ اور ! ساعٹھواد تینوں نوں سے
مٹت! یہ ناقابل یقین خیال عورتوں کے تن چہن پر شراب کے تیز دستہ
نشیک طرح چھا گی۔ اپنی منزل کو آنا قریب پا کر دہ شدت احساس سے
خنوج سی ہو گیں۔ پچھے بھی ایک ہمیندوں کی یاد زبردن کراؤں کے سینے میں
عورت آئی۔ اپنی کبی ہونا ک حقیقت مستقبل کے سماں اراؤں پر غائب آگئی

یکایک اُن کو اپنے شاداب گاؤں یاد آنے لگے۔ اپنے جوان بھان بھال
اپنے نجیت نجیت مان باپ، جن کے بے گور و گعن لاشے گھیوں میں پڑے
سڑد ہے تھے۔ اپنی اوس سس اوس بھیں جو کھیپوں میں بیٹھی فرشتوں کا
انتخار کر رہی تھیں کہ وہ انھیں اپنے نوری پر دن میں چھا کر سے جائیں۔
دُو، کمیں بست روڈ، مغرب کی طرف ————— وہ
بیٹھے گئیں۔ اُن کے گاؤں پر آنسوؤں کے پر نامے بیٹھے گئے۔ دشاد
بھی رو رہی تھی، بلکہ سبک کر سبک کر اور آنسوؤں کا نکلیں
پانی اس کے جونٹوں پر پھاڑی چھشوں کی طرح ابیں رہا تھا۔ وہ روتی گئی،
وہ روتی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اُس کی پلکوں کو اپنے دامن میں
چھایا۔ ایک عجیب سی غزوگی، ایک عجیب ساخماں اس کے رومن رومیں
پر چھاگیا۔ اسے یوں مکوس ہونے لگا کہ وہ سندھ کی اتحادہ نہروں میں
خوٹے کھارہی ہے اور بے شمار سپنویلے اُس کے تن بدن پر رینگ رہے
ہیں۔ رینگ رہے ہیں !!

رَبُّ الْمَغْرِبَيْنَ

مری دنیا میں تیری پادشاہی

جب اس کی آنکھ کھلی تو بیل کا دبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹین کی ایک
ہمارانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھون رہی تھی۔ دشاد کے چلو میں ایک
نخنی سی بھی رورہ بھی تھی۔ بیج کی قضا سورج کی نزاری کروں میں نمارہ بھی تھی
درختوں پر چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ لہاس پر شہبم کے موڑی چک رہے
تھے، اسٹین پر چل پل تھی۔ ایک گرم چاتے والا گھر کی کے پاس خوانچہ لگاتے
دو دھا بائیں رہا تھا۔

دشاد انہ کے گھر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے تقاضت سے
چاتے والے سے پوچھا: ”کیا یہ مغرب ہے بھائی؟“

چاہتے والا اپنے پلے پلے کریں المفتر داشت نکال کر جسنا " گیوں ؟
لیا نماز پڑھوں اس وقت ؟

اسیں کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اس نے اپنی
حنت کے سطے میں دشاد سے ایک چونی مانگی۔ پھر ماں اس ہو کر اس نے
دشاد کو چند غلیظ ٹکایاں دیں۔ سارا ڈبہ پلید کر دیا راندھنے اور اصبرہ
ہو سکا ؟ راستے ہی میں جن میٹھی ————— ؟ ”اسیں کی مہترانی
جاکر ایک بھروسہ سے مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے مل کر
دشاد کر ڈبے سے نکال دیا ۔

پڑیٹ فارم پر ایک سامان لادنے والا خیلا کھڑا تھا۔ دشاد اس
کے ساتھ پڑھ لکا کر میٹھی لگتی۔ سامنے چاہتے کاشال تھا۔ تابنے کے چکدار
سامدار سے ابلىتے ہوتے چاہتے کے بھلے بھیچ دریچ نکل رہے تھے جیسے
گئی نازینی کے گیسو ہوا کے دوش پر ہمراہ ہے ہوں۔ اس کے لئے چلوں
کی دوکان تھی۔ رنگ بریگ کافر دن پر کندن کی طرح دیکھتے ہوتے لیکے
ٹکرئے اور مانئے سجالتے رکھتے تھے۔ ایک لائی ہوا سرخ انار چھا بڑی
میں پڑا تھا۔ چوت کے ساتھ انگر دن کے بڑے بڑے خوشے ٹک ہتے تھے

رشاد کا لالا کانٹے کی طرح خشک تھا۔ اس کی زبان پر گدھے گدھے میلے میلے
حاب کی پرڈیاں جی ہوتی تھیں۔ اس کے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار ملگ
رتا تھا۔ اس کی مکریں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اس کا سامنا بدھ
ایک دُکھتے ہوئے چھوٹے کی طرح چڑھ کر رہا تھا۔

دشادنے اپنی بیٹھک زبان ہونٹوں پر پھری۔ اس کی تھی سی بھی
پوربیاں کی طرح اس کے یعنی سے چھٹی ہوتی چس چس دودھ پر رہی تھی۔
کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ رات بھروساتی ہی رہی اور مغرب کی سہا نی
منزل مقعود کو پہنچے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شاید اسی سیٹیشن
کی قلک بوس عدالت کے پہنچے اس کا ریسم خان اس کے انتقال میں کھڑا
ہو یا شاید وہ لوگوں کے ان جگہوں میں کھویا ہوا اُستے ٹاکش کر رہا ہو
جو پیٹ فارموں پر ادھراً دھرم رہے تھے۔

وہ کوشش کر کے اٹھی، کہ لوگوں کے ہجوم کے قریب ہو جاتے
یہاں اس کے ٹھنڈنے کا سے بچ کر رہ گئے۔ اس کی پندتیوں میں رعشہ
سآ گیا اور وہ سر تھام کر ٹھیلے کے سماںے پھر بیٹھ گئی۔

وہ خوش پرشن، خوش شکل جوان رہ کے اتحاد میں انہوں نے پیٹ نام

پر شل رہتے تھے۔ ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ دو صورت کے پاس مگار تھا جب
وہ دشاد کے سامنے سے گزرتے تو دو تک پیچے ٹڑمڑ کر اُسے دیکھتے
ہوتے۔ رفتہ رفتہ ان کے چکر کی طراست کم ہوتی گئی۔ وہ بالآخر وہ دشاد کے
ہین سامنے گزرتے ہو گئے۔ دشاد کا دل زور زد سے پسیوں کے ساتھ
ٹکرائے لگا۔ یہ رجہا کا ایک عجیب ساتھا ہاں اُس کے دامن پر چاہیا۔

چکور کی مسجد میں اگر کوئی اُسے گھور کر دیکھتا تو وہ بے بسی کے عالم
میں اپنا جسم ڈھیلا چکور کے بیٹھ جاتی تھی۔ یہ نکھل سے محمود خاکہ اُنگھے
لبوں سے گھورنے والے کے لئے اُس کا گوشہ نظر حضرت کرد کو
دیں گے۔ لیکن ریلی میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے ان خوشگوار توقعات کا
سہما پکڑا یا تھا، جو مغرب کے تھور سے اس کے دل اور دماغ میں بسی ہوتی
تھیں۔ اس یہے وہ سرپنے تھی، کہ شاید یہ غوبصورت جوان دہ مہربان بحال ہوں
جن کے خون کی کشش انبار کیکپ کی عورتوں کو ہر لمحہ اپنی طرف ٹھیپنا کرتی
تھی۔ اس بحال سے دشاد کے دل میں خوشی کی ایک سرسی ناچی۔ وہ تو مسلکا
بھی پا ہتی تھی۔ لیکن اُس کے بدن میں دددی میسوں کا طوفان سا، ٹھاہر اڑا
اس یہے وہ بار جو کوشش کے باراں ملور پر عین مسلکا نہ ملی۔ پھر بھی محبت

رب مغربین

کا جتنا پوچ اس کا دلختا ہوا، رستا ہوا جنم انھار سکتا تھا، اس نے پنی
ہنگھوں میں سیٹ کر اُن فوجوں کی طرف بُشے پایہ سے دیکھا۔
”انور!“ ایک فوجان سگریٹ کا دھواں دوسرے کے منہ پر چھوڑ
کر گر مجوشی سے مسکرا لیا۔

”رشید!“ دوسرے فوجان نے گر مجوشی کا جواب گر مجوشی سے

دیا۔

”انور! رشید!“ دشاد گویا صرشار ہو گئی۔ یہ دن نام اس کے کافون
میں آبِ حیات سا پُکال گئے۔ ہمینوں سے وہ ایسے، نوں نام سننے کے
لیے ترس لگتی تھی۔ اس لے گاؤں کے انور، رشید، محمود، شیخ خالد جادو
توہنت سے مت گئے تھے۔ ان کی جگہ اس کے تعمور میں اب شمشیر سنگھ
امرکیب سنگھ، کرتار سنگھ، تربوک سنگھ، پنجاب سنگھ، سورکھو سنگھ اور دہلیار
سنگھ کے نام اڑدھوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان ناموں کا زبردستیں کی رُنگ رُنگ
میں خون کی طرح سرایت کر چکا تھا۔ ان کی سڑا اس کے روئیں روئیں میں
بس ہوتی تھی۔ ان کا وحشی اپال اس کی ہڈیوں میں درد بن کر رپعا ہوا تھا
لیکن اب جو اس کے کافون نے رشید اور انور کے نام سننے تو اے

یوں حکوم س ہوا جیسے وہ آپ کوٹر سے نماری ہو۔ جیسے وہ پاک و مصطفیٰ پانی اُس کے لئے ہوتے اُسرے ہوتے جسم پر چکا اور کافر کی خوشبوی میں چڑک رہا ہو ————— اس کی گری ہوتی گردن میں انشار کا بھار آگئی۔ اس کے مايوس اور غم دیدہ سینے میں امید و صرفت کی رنی پھرث اٹھیں اور اس نے اتحاد کے اشارہ سے ان دونوں گروہوں کو اپنے قرب بلایا۔

۱۔ یہ کیا جگہ ہے بھائی؟ دشاد نے پوچھا۔

۲۔ لا ہو رہے ہے: انور نے کہا۔

۳۔ تم کہاں جاؤ گی؟ رشید نے پوچھا۔

۴۔ جہاں قیمت سے جلتے؟

۵۔ باپ رے بآپ؟ انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

۶۔ بڑی سپورٹ ہے بھائی؟ رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

۷۔ آؤں، تم چارے ساتھ چلو۔ دونوں ہمراں ہون گر بوسے۔

جب دشاد حیلہ کا سما را سے کراٹھی تو اس کے بھائیوں کو پہلے

بار اپنی نخنی سی بجانبی کی جھلک دکھائی دی۔

رب المغربین

- ۱۰ اے "انور حیرانی سے اچھلا۔
 ۱۱ یہ کی بلاتھے؟ رشید نے پوچھا۔
 ۱۲ رکی ہے جی۔ دشاد کچھ بچکپیا تی، کچھ شرمائی۔
 ۱۳ بڑی چھوٹی سی ہے؟ انور نے جائزہ لیا۔
 ۱۴ ایک ہی دن کی بھے جی۔ دشاد آخر بھائیوں سے لیا کے، یہ
 نہ لکھے۔
 ۱۵ آخ تھو" انور کو اپنائی سی آئی۔
 ۱۶ لا حل ولا قوت" رشید کا جی متلا یا
 وہ دو فون بھائی تھے کرتے کرتے بیچے اور تیز تیز قدم والے سے
 چلے گئے۔ سامنے والے پیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھر لیں
 سی شلوار اور قمیض پہننے جا رہی تھی۔ اس کا دھانی دو پہ اس کے مددوں
 شافوں پر لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے چھلانگیں مار کر سیل کی پڑی
 کو عبور کی اور ناٹھوں میں ناٹھ دیئے اس خوبصورت عورت کے تعاقب
 میں چل کھڑے ہوتے۔
 دوپھر کے وقت سیشن کی روئی ذرا ڈھل گئی۔ دھوپ میں تمازن

کا اثر بڑھ گیا اور مہربان سورج کی کرنیں دشاد کے رُجھتے ہوئے جنم کی
مکور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنے میم کے ساتھ پیٹ فارم پر دھوپ بینک راتھا
ان کا چھوٹا سا لڑکا دشاد کے قریب اپنے کتنے سے کھیل رہا تھا۔ جب
اس نے دشاد کی نفحی سی لڑائی کر دھوپ میں یعنی ہوتے اپنے چھوٹے
چھوٹے ہاتھ پاؤں مارستے دیکھا تو اس کی آنکھیں فرط حیرت سے
پھیل گیئیں اور وہ خوشی سے چیختا ہوا بجا گا اور اپنی ماں کو یہ بھوپہ دکھانے
کے لیے گھسیت کر لے آیا۔

اد دندر غلِ محی، ادا دندر غلِ بچہ، حیخ را تھا اور حیرت اور
مسرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔

دشاد کی میٹی ایک پھی سی چادر میں پیٹی ہوئی اپنے نفحے نفحے گھونٹنے
کا آسان کو دکھا رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارق سما
کی کوئین کو اپنی ہٹوکروں سے دھنک کا رہتے تھے۔ انگریز کا بچہ اس نفحی
سی چیز کو دیکھ دیکھ کر تابا یاں بجا تھا، ناچتا تھا اور ہر لمحہ اوس کو شش بڑھاتا
کہ وہ اچکٹ کر اس چاندار الحلوتے کو اپنے ٹھوٹوں میں اٹھاتے۔ اس

بِلْغَرْبَةِ

اس کی ماں نے اُس سے دانٹا کر دوسرتے کی چیز کو اتحاد نہیں لگایا کرتے۔
لڑکا مچل گی۔

• جم تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے : رُنگ کے باپ نے اُسے
چکارا۔

• جھوٹ " لڑکا درد رہا تھا۔

• ہاں، ہاں بچے، ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے : رُنگ
کی ماں نے وحدتہ کیا۔

• تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لاد دے گے؟" لڑکا بات پک کر تا
چاہتا تھا۔

• بہت جلد امیر سے بیٹھے بہت جلد : باپ نے اپنی بیوی کے گاؤں کا
جاائزہ یا، جس کی گولائی پریث کے اد پر بہت پھیل ہوئی تھی۔ بیوی نے
مردا کر مت پھیر دیا۔

• ممی ! اس کھلوتے کو چاکیٹ دو !

• نہیں بیٹھے، یہ چاکیٹ نہیں کھا سکتی ہے۔

• اچھا تو ممی، اسے ایک ہمدرد سا سرٹ دو ہے۔

یاختا

”ہاں میرے ڈارٹگ، ہم اسے کپڑا دیں گے۔“

”اور پیسے بھی، میری ممی!“

”ہاں پیسے بھی میرے ڈارٹگ۔“

رہ کانوٹی سے چینچ چینچ کر چھتر تایاں بجائے رکا اور سب اس کا
بھی اس کیل سے بھر گیا تو اس کی ماں نے دشاد کو اونی کپڑے کا ایک
مکروہ اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جانے لگے تو دشاد نے دل
بھی دل میں اس بچہ کو دعا دی۔ جو پہلی بار اُس کی زندگی میں رحمت کا
فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔

جب دشاد کے ہاتھ میں پیسے آگئے تو دنیا کے ساتھ اس کا رشتہ
از سر تو قائم ہو گی۔ ایک چلتے والے نے اس کے پاس اکر گرم چلتے
کی ہمک لگائی۔ ایک ”گوشت روٹی“ والا بھی اس کے نزدیک اپنا
خوانچہ سے آیا۔ اور جب دشاد روٹی کھانے لگی تو ایک کتاب بھی زبان کھال
اس کے سامنے آ بیٹھا۔

قریب ہی ایک بچہ پر دہنڈگ بیٹھے رائے زنی فرمائے تھے۔
ایک کی داؤ صی سفید تھی، دوسسرے کی خائی۔ دونوں کچھ دری سے انگریز

رب المغپین

اس کی سیم اور بیچے کی حرکات پر ناک بھوں چڑھا رہے تھے جب سیم نے
دشاد کو اونی کپڑا اور دپانچ روپے خیرات دیئے تو ان دونوں بزرگوں
کو یہ محوس ہوا کہ اس فرنگی نے ان کی داریوں کو کٹا کر زندگی سے
جھٹک دیا تھا۔

”لاحول ولا قوۃ“ ایک حضرت خفا ہوتے۔ یہ عراہی اب تک بحثت
ہیں کہ تم انھیں کے مکرر دس پر پل سہے ہیں؟

”اے میاں تصور ان کا نہیں۔“ دوسرے صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔
لیکن نہیں اس کم بخت عودت نے ایسی ذمیل خیرات کو نفرست سے ٹھکرا دیا؟
”انہا اللہ آزادی تو میں، لیکن قدر می کا چکانا نہ گیا“

”جاتے کیسے میرے بھائی جاتے کیسے؟ جب ایسے آزادوں کی
جو یوں کے صدقے مفت کی گوشت روٹی میں تو آزادی کی محنت کا باہر
کون اٹھائے؟“

”اے ظالم لاہول اس رزق سے مرد اچھی۔ جس رزق سے آتی
ہو پرواز میں کوئا ہی۔“ پتلے بذرگ نے رقت سے الاپا۔

دوسرے صرفت نے بھی آزادی اور خودی کی غنائمت میں کچھ مصروف

ارشاد فرمائے۔ جب دشاد چار آنے کے گوشت تین گنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے دوزخ شکم کو ایندھن دے چلی تو وہ دو نون بزرگ بیش فرباگر اس کے پاس آئے۔

لے عورت یا تم مهاجر ہو۔ ایک نے شلگیں انداز سے پوچھا، جیسے زندگی صفت کا قاضی کسی زانی یہ عورت سے خطاب کر رہا ہو۔

”بھی نہیں، میرا نام دشاد ہے۔“

”اے ہوگا، لا حول ولا قوۃ۔ ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جاؤ گی اور یہاں پر تمہارا کی کام ہے؟“ وہ سو سے حضرت نے مہاری کی۔ لے کاش دشاد کو معلوم ہوتا کہ اس کی نیزی مقصود کا نشان — کس شاہراہ پر ملے گا۔ اس کے تھیں میں تو مغرب کی ساری کائنات اس کی نیزی تھی۔ وہ تو ایک ایسی دسیخ براہدی میں شامل ہونے والی تھی جس میں اسے سارے اپنے ہی اپنے نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی ایسٹ ایسٹ اس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟ تمہاری جیب میں پیسے ہیں؟ تھیا سے جسم میں تانگل ہے؟ —

”تم مهاجر ہو۔ ایک بزرگ نے غتوی دیا۔“ تم مهاجر خانے چل جاؤ۔

رب المغزین

اہزادِ قوم کی بیٹیاں بھیک کے نکڑوں پر نہیں ملتیں ہاں؛
”تم کوئی بچہ نہیں جو۔ تمیں خود شرم آتی چل جائے۔“

دشاد دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شاید وہ بزرگ ما جر نام کی لڑکی کی
خواش میں تھے۔ جو کوئی لڑاہ کی فرمانزدگی کے محترمے بھاگ گئی تھی۔ میں شام
تک بست سے ووگن نے اُسے جی پکاما اور سب نے اُسے ما جر خانے
ہیں پہنچے جانے کی تعینات کی۔

ما جر خانہ ————— سافر خانہ کے وزین پر۔ ایک دفعہ جب
دشاد اپنے ابا کے ساتھ شہر گئی تھی تو دو دنوں عابری مونی کے سافر خانے میں
محترمہ تھے ————— سافر خانے میں چھوٹی چھوٹی کھڑیاں تھیں
ایک بھیاری ان اوپلوں کی آگ پر کاش کی دال اور چاٹیاں پکار رہی تھیں جب
دشاد اس کے پاس چائی پر کھانا کھاتے بیٹھی۔ تو بی بھیاری نے بست سا
تمی پاڑ کے ساتھ مجھا رکراں کی دال میں ڈالا اور گرم روٹیوں پر تازہ
مکھن رکھ کر کھاتے کو دی۔ ذات کو جب غافل بخش عشاکی تماز پڑھتے
ہی، تو بھیاری دشاد کی چارپائی کے ساتھ اپنی چارپائی لگا کے لیے

لئی اور دیر تک اسے مزیدار کہا نیاں ساتھی رہی۔ کبھی سات بیٹوں والے راجہ
کا قصر، کبھی پوین کی پادشاہ زادی کا افانتہ۔ کبھی اپنے بھیڑا سے گل جیون کافی
بھیڑا ان کئی دفعہ روئی، کئی دفعہ سہی۔ اور آج کج جب دشاد شهر کی بادیتی
برادر کوں کا تخلیل یا مصیتی، تو اس کے پروردہ خیال پر حاجی موسیٰ کی سرائے کا عکس
اُبھرنا آتا اور اس بھیڑاں کی تصویر بھی جو کبھی روئی تھی، کبھی مہستی تھی، اور
کبھی دشاد کو گرم گرم چاٹوں پر لمحن کے پرڑے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی
جہا جرخانہ ————— شاید ما فرخانہ کا بُرڈا ایوا نامہ بُر جیسے
لاؤں والے بہستان کو ڈاک خانہ کہتے ہیں۔ شاید شہر اے سافر خانہ کو
جہا جرخانہ کہتے ہوں ————— یعنی اس کو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند
نہ آیا۔ حاج جو بھی کوئی نام ساتھیم ہے جعل؟ دشاد تو ڈاک رسیدنامہ تھا۔
اس نام کے ساتھ عالمی بخش کی یاد و ابستہ تھی جس نے قرآن شریعت
سے غال نکال کر اسے یہ نام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم حشان
کا افانتہ مجبت بھی منظوم تھا۔ وہ دشاد کے ساتھ اباد بیدار اسیاد
کے تکافیتے باندھ کر بڑے رس س بھرے درد ہے گھیا کرتا تھا۔

رب المغربین

عاجر خانہ ————— جب دہ عاجر خانے پہنچی تو لہور کے
تالوں پر رات کے لیبر میل رہے تھے۔ عاجر خانے کا افسر دیکھ
چکو لہاری میں وحشی کھوستے بیجا تھا، کچھ دوسرے کے بعد دشادھی پادھی آل
ذنم؟ افسر نے طریقے کی طرح دشادھی علوان دہرا دیا
۔۔۔ داؤ شکار

”غمزہ“

”بیس سال“

”بیپ کا نام؟“

”مل علی سخن“

”زندہ ہے یا مر یا؟“

”مارڈ والا گیا“

”گاؤں“

”مکبرہ“

”صلیع“

”انبار“

اور لوئے ہوئے داول کی مخصوص ہڑتائیں کپکاری تھیں، قرقواری تھیں اور ہر جس یہ دلکشا تھا کہ کسی وقت سکون و بند، کا یہ معمونی ظلم یا کیک
لوٹ جائے گا۔ اور ایک زبردست طوفان ایک بے نیاہ لڑالہ ایک ہولناک پانچھار زیین اور آسان کے لحاظ کو درہم برہم کر کے رکھوے گی۔
دشاداپنی پنجی کو جیسے سے لگائے قدم پچوک پچوک کر جلتی تھی۔ جس طرح قبرستان میں پھاپھا کر پاؤں رکھا جاتا ہے کہ کبھی کسی مقبرہ میں
کوئی تکرہ لگ جائے۔ کچھ بجا جوں تباہیوں پر چادریں آن ہان کر چھوٹی چھوٹی جھپٹیزیاں ہاتھی میں پکھوچا جوں کی طرح ہوں
یہ آسان تائیٹھے ہوئے تھے۔ آسان بیری لدر پر شتم فٹاٹی کرے۔ کسی کے پاس پاپا تھی تھی کسی کے پاس مکبل اسکی کے پاس لاحف
دشاد کے پاس نہ چاہر تھی نہ کمل تھا انخلاف۔ وہ خود ایک پیچھترے بکھرے پڑے تھے۔ سب کئے مل میں ایسہ کی لوگی ہوئی تھی کہ اب وہ اپنی بیاری
سرزمیں پر آگئے ہیں۔ اب اس ارش مقبرہ کی ناک اٹک گئی ہوئے تھے نامہوں پر مرہم ہیں کر لگ جائے گی۔ اب بیان کا تمثیل پانی
اگرست ہوئے رہوں کو رہوں اے گا۔ اب بیان کے سورج اور چاند کی تحریریں اکچاک دہنوں کو روک دیں گی۔
ایک نالی ہی جگہ کیک کروٹھا توڑگری۔ پکھوڑہ جگے ایک کہنے سال ضعیف ہوئی اور وہ اپنے بیٹھا تھا۔ اسکے ساتھ ہے چے ایک آنکھوں سال کا
لڑکا تھوڑا ایک گیارہ سال کی لڑکی زیبہ دہوں تھیں ایک نالی کے پیالے پر بھکھوئے رہنی کھار ہے تھے۔ جھوپ پر چھتا تھا کہ دوا آج سان
میں بھٹی کیوں نہیں؟ زیبہ اپنے داول کی کالت کرتی تھی اور کبھی تھی کہ برہنہ کو شست نہیں کیا کرتے اس سے ہبہ طراب ہو جاتا ہے
وہنوں کو کیک اٹک جاتا ہے۔ لیکن تھوڑے بچا تھا۔ دادا سے چکارتا تھا۔ زیبہ اسے دلختی تھی۔ کیا میں چھے اپنی بیٹیاں کاٹ کر دے
وہن۔ وہ پھوٹی ہی بہن اپنے چھوٹے سے بھانی کو جرگوں کی طرح دلختی تھی اور دیکھنے والے کوی مسوں ہوتا تھا کہ اس جھنڑ سے خاد ان کا
نہ بیان دا دیکھیں زیبہ ہے۔ اس لڑکی کا شور اس قدر حساس اور بیدار تھا کہ وہ یک وقت ایک نالی ہی بہن ایک نالی ہی بیٹی ایک نالی ہی
ماں کے فراش انہام دے رہی تھی۔

”کہیں پیش جاؤ نہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی اور بے؟ گورڑے میں دوا نے دشاد سے پوچھا۔
”بھی نہیں۔ میرے ساتھ کوئی اور نہیں ہے۔“

”بڑا دلی لے آؤ ہماری نالے سے تجداد سے پاس کوئی بیام ہے؟“
”بھی نہیں۔ میرے پاس کوئی بر قن نہیں۔“

یاخدا

دادا نے اپنا ایک خالی پایالہ اُسے دے دیا۔

پالا بھی بہت ہے میں۔ تمارے پاس کوئی بستر ہے؟

”بھی نہیں“ میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں۔

دادا نے اس دیرانی بستی پر چدر دی کی ایک بھرلوپر لگاہ دالی۔ وہ بھی بالل اسی حالت میں بیان آیا تھا۔

”بادرچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کبیں مانگ لینا دہلے ہے۔“
پھر دادا نے ستاروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ ”نونجک رہے ہیں شاید سٹور باجوہاں تباہ ہو۔“

بادرچی نے دلشاد کو دوڑ دیا اور پایالہ بھرداں دے دی۔ کپڑوں کے دفتر میں ایک مدھم سی لائیں جل رہی تھی۔ خیکے میں رضاخیوں کے انبار لٹکے ہوتے تھے۔ سرخ سرخ بخوبی سے بھورتے، کامے کامے گلبون گلبون ہوتے۔ اور میں جھوپتیں۔ ایک کونسے میں گرم کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ اونی سو ستر پٹوں کے کوٹ، گرم چادریں۔ — سٹور باجوہ سرخ و سفید چھینٹ کی صاف اونڈ سے چار پائی پر لیٹا ہوا اقبال کا شکوہ گمارا تھا:-

رجھتیں میں تری اغیار کے کاشاؤں پر برق گرتی ہے تو یچاۓ میں سماوں پر

رب المزین

جب اس نے دشاد کو نیچے کے دروازے میں کھڑا ہوا پایا تو اس کے
ترمکی کے سُست پر لگئی اور اس نے نایت خشکیں انداز سے دشاد کو گھورا۔
دفتر بند ہے جی اس وقت۔ بیج آٹھ بجے آنا:

”ہمارے پابن کوئی پڑا نہیں ہے۔ ہم پائے سے مر جاتیں گے:
کوئی نہیں ہرتے۔ بیج آٹھ بجے آنا، ان دفتر بند ہے اس وقت:
دشاد نے ایک بار پھر اتحاد کی۔ سٹور باروں جھنڈائی۔
”میں کتنا ہوں چلی جاؤ سیدھی طرح۔ میں بھی آخر انسان ہوں میشیں نہیں
ہوں، آں بیج آٹھ بجے آنا۔“ اور پھر وہ اپنے نرم و گرم لحاف میں سکلا کر
شکوہ گانے لگا۔ آتے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چڑاغ رُخ زیبا لے کر

جوں جوں رات جیگتی گئی، سردی میں افناہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ
یوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات یخ بستہ ہو گئی ہو۔ سرد ہوا کے
جھونکے تیر دشتر کی طرح بدن میں ٹلتے تھے اور زمین کی نبی زبر آسودہ کا نہیں
کی طرح جسم میں چھپتی تھی۔ دادا کے پاس ایک کبل تھا۔ اس نے اسے آدھا یا پچھے
بچھا کر محمد اور زبیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا کمل اُن کے اوپر ڈال دیا تھا۔

وہ خود ایک پتل سی چادر اور جسے زین پر لیا ہوا کر دیں بدل رہا تھا۔ دشاد کے
دانت کث کث بج رہے تھے۔ وہ اپنی میٹی کو دنی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے
یہ نہ سے چلستے بھی تھی۔ لبھی وہ دیرت جاتی تھی۔ لبھی انہوں مبھیت تھی۔ کہن
کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔ لیکن ہر کروٹ بہر ملپڑ مددی کا اثر سانپ کے
نہ بہر کی طرح اس کی ہے ویں میں سر سرا تما ہوا پڑھ رہا تھا اور اسے در لگتا تھا کہ
شاید اگلے لمحے وہ برف کے نکڑے کی جڑ جنم کر گر جاتے گی۔

کچھ دور آگے ایک جوان گورت اپنے جسم کی گرمی ہر علاں طریقے سے اپنی
چار سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے پاس
بھی نہ کبلی تھا۔ نہ بحاف نہ چاور۔ لڑکی کا سانس الکھرا الکھرا ساتھا۔ اس کے
یہ نہیں میں لکھنیاں سی بیک رہی تھیں۔ جیسے بہت دُور افقی لکیر سے پہ سے
اوٹز کا ایک کار داں کسی جنت کم گشتگی ملاں میں چلا جامنا ہو، چلا جامنا ہو
داں دواں دواں دواں جیسے جیسے سردی ہبڑھتی گئی۔ لڑکی
کے یہ نہیں کلکھنیاں تیر تیر ہوتی گئیں۔ اس کے سانس میں ایک زبردست تناول ہیں
جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اس کے سانس کی رُدھی تھام کر آپس میں
رسکشی کر رہے ہوں۔

رب المغزیین

(اس کی ماں گھبرا گئی۔ ہے بس جو گئی، لا چار ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر گزر دیں
کا جانزو دیا۔ زمین پر انہیں سے کامیاب کرنے چڑھا ہوا تھا۔ بھی کبھی چاند بھی اپنے
خافون کی اوث سے جانکر دیکھ دیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پا کر دہ خورت
سمٹ کر میجھی گئی۔ اس نے چوروں کی طرح دزدیدہ نگاہوں سے ادھر ادھر لکھی
اور جو ہر کے جھلکتے ہوتے اُسرتے شرم تھے، اس نے اپنے پڑے کھول کر اپنی مختصر
ہوئی جایہ بھی کوان میں پیٹ لیا۔ اُنمیں ہے میں ایک بکلی سی لہراتی اور اس جگہ ان
خورت کا برہنہ جسم کا نات کے ذریعے ذریعے کو ملکارستے لگا کہ دیکھ دیکھو ہے لا جھا
ساعت بیت زدھاتے۔ تم نے ارض و سماکے بہت سے دار دیکھے ہوں گے۔
یکن تم اس ماں کے برہنہ جسم کو نہ بھیوں سکو گے جس کے پڑوں میں اس کی
مرقی جوئی بیٹی لپٹی پڑی ہو تو رہا سخت پالا پڑا ہو اور سورہ میں اُرم لمبل اور خافون
کے دیھر ہوں۔ ایری سورہ بالورضائی میں اپنا ہوا "مشکرہ" کا رہا ہو اور ——
خورت کا ہوا یہ حیم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھا گیا۔ رات
کی غلست میں رو سیاہی کی کالک اور بھی زیادہ لگھی ہو گئی۔ آسمان پر تبر ستارے سے
ٹھاکر بھتھتے آنکھیں موند کر پادلوں کی اوث میں چپ گئے۔ چاند بھی اپنے
خافون کے یچ سے جانکر کریے نظارہ دیکھنے کی تاب نہ لاسکا۔ ایک لمحہ سوچ لگتا

یاختہ

جو آسمان پر بے پرداں سے بھری ہوئی تھی، سوت سوت کر اکٹھی ہو گئی۔ اور
بادوں کی پلکوں سے ہوتے ہوتے آنسو گز نہ گز۔

ٹپ ٹپ ٹپ — ٹپ ٹپ ٹپ — بوندیں برس رہی تھیں
بھٹھری ہوئی ہواں نہ نسیکوں کی طرح آجیں بھر رہی تھی۔ جما جرخانے
کے میدان میں نندگی کی ایک کمر درسی لہرجائی، کچھ بے رہت کچھ ہورتوں نے
شور چایا، کچھ مردروں نے داشت باتی اور چھاریک سنا پچھائی۔

مینہ کی بوندیں دشاد کے بدن میں بندوق کے چھردوں کی طرح پورست
ہو رہی تھیں۔ اسے دوں محسوس ہوتا تھا جیسے امریک سٹریٹ روک سنگھ
سور مکھ سنجھنڈ بڑھوک کر پاپیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی
غلابین کے گرم نکڑے میں بھی نفوذ کرتا ہاں اور اس میں پٹی ہوئی تھی سی جان
سردی سے پکپاتے ہیں۔ دشاد نے سوچا کہ الگ وہ دادا سے پوچھ کر اپنی لڑکی
کو محروم اور زبیدہ کے کبل میں ٹا دے تو شاید اس غریب کی جان کو کچھ سماڑا
مل جائے۔ اس نے دادا کے گھنٹے کو ٹلایا۔ وہ اپنی میل سی چادر اور ٹھے
لیٹا ہوا تھا۔ دشاد نے اُس سے شانوں سے ٹلایا، بانشوں سے ٹلایا۔ گرد وہ
سے بھی ہوڑا، اتحد کھینچنے، لیکن دادا کا خاکی جسم سردی اور لڑکی کے احساس

رب المغزیں

سے بے نیاز ہو گی تھا۔ زندگی کا خون اس کی رنگوں میں جنم کے رک گی تھا۔ اور اس کی ٹھیکان سر دی سے اکڑ کر جو بے کی سلاخون کی طرح آن گئی تھیں۔

جب صحیح صادق کی پوچھی تو مبارخ خانے کے میدان میں ایک مردیں جعفر شاپنگی کی طرح تجملہ لایا ہے اس جوان عورت کا برہہ جسم تھا جس سے پانے کیڑوں میں اپنی مرتبی ہرلئی بچی کو پیش کیا تھا۔ اس کے بے جان سینے سے اس کی بچی کی لاش یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ پینے ملی ہو معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فن کارنے فرما کر تراش کریں خو صورت بت نہ سائے ہے۔ عورت کے کئے ہوتے دددھیا بدن پر بارش کے قھرے مویوں کی طرح جملگا رہتے تھے۔ اس کی گھنی زلفیں کھئے ناؤں کی طرح بھری پڑی تھیں۔ اس کی نیم بازوں میں پانی کی ایک تسمی جوئی تھی جیسے اس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی مجھہ ہو کے رہ گئے ہوں۔

ماجرخانے کے پچھے مستر مکبوس کا پلنا اٹھا کر سے آتے۔ ایک کبل انہوں سے دادا پرڈال دیا۔ درد صراحت کے شلے بدن پر، تیرسا اس کی بچی پر جو تھا۔ اور اسی طرح ددہ میدان میں بھری جوستے لاثون پر نہ کنگرم گرم کلموں کے لئے ذلتھتگتے ہو گوں زندہ تھے وہ حسرت بھری گاہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف

۔ نیا خدا

دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر بوت کے تصور میں ایک ان دلکھی ان جانی
ان بھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا۔ تو وہ سب برصادِ غبت، ہیں مر جاتے تھے مگر ما جو خانے کے
متر ان پر بھی اُن بُل دلتے جاتیں۔ اور ان کے پل پتے ہوئے گوشت اور فُخْرَتی
ہوتی ہیں کو زدرا سا سکون، قدر اسہارِ عربی، قدر اس آرام میسر ہے۔

محود پل رضا تھا کہ دادا کو دہلوگ انعام کر لیا سے گئے؟ زبیدہ نے
سمجھا تھی کہ دادا اپنا اور اپنی کو جانت گئے ہیں۔ وہ کب ایسے گئے؟

وہ بہت جلد آ جاتیں گے، میرے محود، وہ تو سب اُتے ہی ہوں گے۔ اپا اور
اتی کیاں گئے ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے اتفاق میاں سے سننے گئے ہیں
وہ اس کے دربار سے تمہارے لیے عذر، عذر کھلنے لائیں گے۔ شیشے کا
ٹوٹ، پڑ کی آینہ، چابی والی موڑ نئے بُٹ نئے دار ٹوپی۔ — محود
کا تحمل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا، زبیدہ طرح طرح کے جواب بُغُر
کر اُسے ناسی تھی اور جب بھی محمود اور هزادہ نجیبل میں لگ جانا تو وہ نظر
بچا کر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

ما جو خانے کی مشین بائیکوپ کی طرح پل رجی تھی، جس سے شاہ بُگ
اس کے پردے پر بھانت بھانت کے سین آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔

رب المغزیں

باید بھپ اخال بے دینا مرے آگے ہوتا ہے شب بزرگ اس مرے آگے
 بڑے بڑے دم بے دلشد میں اور نواب آتے تھے اونچی اونچی کریوں
 دلت دکام آتے تھے مرمراتے ہوئے ریشم و گھنواں میں مہوس لیبوں کی طرح
 بھجے ہوئے حسن میں سرشار حکاب اور پیشی کے عطر میں ملکی ہوئی بیگانات جل قصیں
 وہ سب بچوں کے سر پر شفقت کا اتحاد پھریتے تھے گرد توں کے پاس گھر سے
 ہو کر ان کی آشک شون کرتے تھے بورڈھوں اور جوانوں کی پیشوں خونک کر
 ان کی بُونی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبلکار موڑیں انجیں جما جو خانہ
 سے واپس سے جاتی تھیں کوئی منھانی لاتا تھا کوئی کپڑے بانٹتا تھا کوئی
 پلاو اور تو رستے کی دلگیں تقسیم کرتا تھا اور جب کوئی اس کا رخیر میں بند
 چڑھ کے حصہ لیتا تو اس کے پھرے پر فخر دسترت کی سرفہی پھیل جاتی اور وہ
 دل بسی اول میں اپنے رعنائی اور رحیم کا مشکل کردا کرتا کہ اس نے اپنی قدرت
 کا خر سے ایسے سان پیدا کر دیئے جن کے فنیں اس ناچیز کو بھی مقدار بھیر
 خیرت کرنے کا موقع نصیب ہوا ————— دشادسو ہوتی تھی کرجب کوئی
 جوان مرد محرورا زربیدہ کا قصہ سنتے گا تو سڑر بالا کو کان سے پکڑا کر گولی
 سے اڑا دے گا کہ اس نے اس کرنا کے لیے سردی میں بھی دادا کو عرفت یا ک

بھی کہل دیا۔ وہ درستی تھی کہ جب بخوبی رہدے ہے واسطے مٹھنٹھے والے یہندہ اپیال
وگ اس کی اپنی رام کانی سینیں لگے تو ان کا خون بخوبی اُٹھے گا۔ ان کی عیرت کو
شدید پھٹکتے گئے۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر امریکی شاگروں ترلوں سنگوں
کرتا رہا شاگروں دبار شاگروں کی خاش میں چلن لکھیں گے۔۔۔ یہن سنتے واسطے
گئے، سندھے دلے ساتھے گئے۔ دن میں مٹھانی اور پلاوف جیسا گیا دات کو رہتا نی
ہوا کی شمشیر اپنے دار کرتی گئی اور جواہر خانہ کا باہمی گوپ پرستر چھاگی۔ ایک
سین کے بعد دوسرا سین، دوسرا سے سین کے بعد تیسرا سین۔۔۔ نہ آغاڑ
نہ انہام ایک مسلسل اور پچھہ و اُنھیں ترجمہ کر جس میں انسان انسان کا رازق
بُنھنے کے لیے ہے قرار ہو، بے چین ہو اور اس بازی میں دوسروں پر
بُستقت سے جانے کے لیے ہر قسم کا دار ہر قسم کا پیچ پھیلنے پر تلاہ ہوا ہو۔
ایک صاحب بڑے غیرت تھے۔ بدن پر خوشنا سوٹ سر پر پرچی ڈپنی
آنکھوں پر سونخ کے فیم والی بزرگیں اگے دانتوں میں سہری کلیں منہ میں
پاپ انگلیوں میں لعن اور یا توت کی بیش بسا، نگوچیاں۔۔۔ وہ گھنٹوں
جواہر خانہ میں گھوستھتے۔ ایک ایک کی داتاں سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے
تھے۔ کسی کو مٹھانی کی گویاں۔ کسی کو چاکیت۔۔۔ وہ شادر پیجی ان کی خاص

رب المغزیین

نظر غایت تھی۔ ایک روز دو اس کی بھی پکے لیے سرخ ادن کا دیدہ نیب سُبْر
لاستہ۔ دوسرے روز انہوں نے رسمی خان کی طالش کرنے کا دعہ فرمایا اور کچھ
دنوں کے بعد وہ دشاد کے لیے ایک جانقرا عینہ کا پیغام ستراتے کہ حیم خان
کا پتہ مل گیا ہے۔ بچارا بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے محدود یعنی دشاد
کی یاد کے سماں سے وہ بھی تک بامزیت اٹھائے جیتا ہے۔ دشاد کی نظریں
دنیا گھن رہ گئی۔ جاہر خان کی زمین پر چول ہی چول آگ آتے۔ اس کے
پن میں سلسلہ والا نیہر کا فرد کی طرح شکپا۔ بڑی اور وہ اپنے رہڑکتے ہوئے
یعنی میں ادا نوں کلب پناہ چو جم چھپائے مر مصنف خاں یکابی کی موڑیں آ
بیٹھ کا۔ فرستے بھرتی جا رہی تھی۔ لا بود کی مژگیں زمین سانپوں کی عزت مہالعا
کر گزر ہی تھیں۔ یہ باعث جفا ہے: یہ گلستان فائدہ کی چار دیواری ہے۔ یہ کہ
منظر کا بت ہے۔ یہ ماں روڈ کے زمینیں سیوران ہیں۔ یہ نیلانہ کا چوک
ہے۔ اس گلی میں اندر کی مقبرہ ہے۔ یہ گر جابتے۔ دو مسجد ہے۔۔۔۔۔ یہ
معروف خاں یکابی کا مختلف بنگلہ ہے۔ تو کروں کے کرسی میں گرازون بجھا
ہے۔ آج کرسے جی بھر کے سنگاڑ تو بے جا ہے۔۔۔ آج کرسے جی بھر کے سنگاڑ
دشاد کا ول دھک دھک بیک رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک

انوکھے سردار کا ترم تھا۔ وہ براہم سے میں بنتے ہیتے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر حیم خاں کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بیکھر کی ہوا ہیں اس کی دلاؤ نہ سافی بسی ہوئی ہو۔ دشاد کی نظر عقیدت میں بنتے کی زمین کا ذرہ ذرہ مکاہر دنیہ کی خاک بن گیا۔ بیکھر کی ایمنت اینٹ پر سجدہ کے تقدیس منار سے تغیر جو گئے ایک تو کرنے اسے ایک پیٹ میں پلاو۔ ایک میں پاک اور گوشت۔ ایک میں مٹار قیر، ایک میں کیوڑے میں لگائی ہوئی فرنی دکر ری معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی اور کب لھائی۔ وہ دنیا دنیا فیما سببے خبر تھی۔ اس کی روشن اپنے۔ حیم خاں کے استقبال کے لیے ہر لپا انتظام بھی ہوتی تھی میکن اس کے جسم کو ابھی تک کئے چھوڑ رہتے تھے۔ مصطفیٰ خاں سیاہی ڈرینگ کا دن پہنے اس کے سامنے جو کے ٹوکڑے کی طرح منہڈ لادتا تھا۔ میز پر سکاچ دسکی ل بول جگہ رہی تھی۔ وہ اپنی ہاتھیں پھیلا پھیلا کر کتنا تھا۔ کہ میری جان، آکر میرے سینے سے مگ جاؤ۔ تم بڑی منظوم ہو۔ تم بڑی غریب ہو میکن میں ایک میرا انسان ہوں یہ کچھ دز کے لیے تمہیں ملکہ بنانے کے رکھوں گا۔ تھا رحیم خاں معلوم نہیں کہاں کھوئی۔ شاید وہ کسی دیرانے ہیں مر اپڑا ہو۔ یعنی تم اس فرضی ستر

رب المغزین

کی مادیں اپنی جوانی نہ گزادری؟ میری جان آؤ۔ میرے سینے سے لگ جادا ب
تم اپنے آزاد دہن میں آگئی ہو۔ اب تمہیں کسی بات کا ذرہ نہیں۔ یہ جہاراٹی
ہے۔ یہ جہارا آزاد وطن ہے۔ پاکستان نہ ہے باد؟ پاکستان پائندہ باد!

دشاد کے لگنے میں خالق بخش کی تسبیح نہ کہہ تھی۔

جب مصطفیٰ خان سیہاںی کی زبان پاک پک کر تسبیح کے دافون کو چھوٹی
تزویہ دشاد کریم مدرس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنتگ اسود کو بوسرہ

دے رہا ہے

دو چار دن میں جب مصطفیٰ خان سیہاںی اپنے عج کے اکان پورے
کریے تو دشاد پھر مہاجر ہونے والیں آگئی۔ بخا محمود شیشے کا لٹوچارا
تحا۔ اس نے ستائیا کرتا یاں بجا بجا کر دشاد کو سمجھایا کہ زریدہ باہی۔ بھی
موریں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی۔ دادا میاں نے شیشے کا یہ نتو
مجھا ہے۔ یہ رہڑ کی لیندہ یہ زنگ دار سمحانی، آج رہ پھر موریں بیٹھ کر
دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ مور پوں پوں کرتی جا رہی ہے۔ اب رہ
پھر دادا میاں سے پیسے لانے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی۔ تھے دار
نُپی لائے گی

کراچی

دشادنے کھڑکی سے من نکال کر دیکھا۔ صدر کے اسٹیشن پر گھامی تھی
لیفیو جی پیٹیل کی مخلوق گاڑی سے نکل نکل کر پیٹ فارم پر جمع ہو رہی
تھی۔ سارا سٹیشن لکھا پچھ جبرا ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھڑا باروں کی
مرج چھٹ گئی۔ پیٹیٹ فارم پر کچھ تھی، کچھ باہر جانے والے صاف اور کچھ
مکٹ سکری باقی رہ گئے۔ آن کی آن میں لیفیو جیوں کا جنم غیرہ بے ہی تھروں
کی مرد کراچی کے عجید بے کراں میں غرق ہو گیا۔ جیسے سندھ کی تیز دستہ
ہر ساحل کے خس دخواش کو اپنے تروچ میں بدلتے جانتے یا جیسے سورج کی اڑی

شہم کے موتیوں کو اپنے دامن میں چھاپیں یا جیسے شراب کا نہ دل کے گوشے
میں فرزندہ اندیشوں کو اپنے خارکی آخوشیں سلاسلے یا جیسے کسی غصتی ہوئی،
مرثیٰ ہوئی ناکش کا تعفن الغلب اور صوتیتے کی شہم کو اپنے یہ نسے کے لند ریختیں کئے

مہوراً آئی لینڈ تیرز تیرز تعمقوں کی روشنی میں جگدگ کر رہے ہے — کھٹکی
بیچ پودھوں رات کی چاندنی میں نایا ہوا ہے۔ سندھ کی سڑیں ساحل کو چڑھڑا
چھیر کر ایک مدھوں سا بابیہ بھاڑی ہیں۔ ہرول کا پال بیٹھے ٹیلوں سے ٹھرا
کر فضا میں نظری فواروں کی طرح جھلکتا رہے۔ ہوا میں ایک نازک سی خشکی
ایک نرم سی ٹھانگت ہے۔ زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ بیچ پر مخور سانپوں
کی طرح نہ رہی ہے۔

چار چومن دسکی کے جام بھر کر سوڈا ملار ہے ہیں۔ اتنے اتنے
دلی ہے۔ ایک نے یعنی پڑھمار کے آہ بھری۔
سواد و دلہ الگبری میں دلی یاد آتی ہے۔ اتنے رہی دلی دوسروں سے
تے وا دیٹا کی۔

”کون جلتے ذوق یہ دلی کی گھیاں چھوڑ کر

ہنسے دل، تیری خاک پاک کی کشش، میسرا انوں پر تھیز مار مار کے ماتم
کرنے لگا۔

چوتھا جوان سمجھیہ رہا۔ وہ دسلکی کا جام ہونٹوں سے چپائے مرائبے میں
لیا ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے ذرا زور دشوار سے دلی کی نوحہ خوانی
شرع کی؛ تو وہ چنگا۔ ————— ایسی؟ یہ تو دیسی سالی کلامی رسی۔
دائد خواب تھا جو کچھ کر دیکھا جو سنا انسان تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ چاہڑی
بازار میں چل سل ہے۔ بی چاند جان کا بالا خانہ ہے اور وہ ساتی جھوش اپنی
خانی انگلیوں میں سفر اٹھاتے آ رہا ہے، لارا ہے، آرٹیسٹ، لارا ہے۔
ہستے ہستے دلی؛ ہستے ہستے دلی؛ ہستے بی چاند جان، ہستے بی چاند
جان ————— وہ چار دن ایک فصیح دینیت مریثے کی دھن میں
محو گئے اور ٹھنڈی ریت پر ٹوٹ لوٹ کر اپنی حنست لہم کر دہ کا ماقم کرنے لگے۔
کچھ دو بڑے ایک مقفع و متشرع بزرگ پان چار ہے تھے۔
ان کے آگے چند عقیدت مندد دوزانوں بیٹھے تھے۔
”دلی گئی، دلی دا گئی، سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا۔
پان لا فر“ بزرگ نے فرمایا۔

رب العالمين

اُن کی خدمت میں پان پیش کیا گی۔

تما کو ترا چاہے بھئی ۔۔۔ بزرگ نے اسے دی: کافی سے لاتے ہے؟
کسی نے عرض کیا۔ ۲۹ روپے سیر ہے، مکنٹ سے منگوایا تھا۔
ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دلی گئی۔ بزرگ نے اپنی ٹوپی ہوئی کافی کو
از سر نوچ گذا۔ دلی دلستھے، کیوں؟ جانتے ہو جلا کیوں؟
عجیبت متہ سوچنے لگے کہ کیوں؟ اسی کے چہرہ دل پر کیوں کی سوالیہ
علامت ٹھپیں کر لگ کیوں؟

بزرگ نے خود میں جواب دیا: دہ لال قمر، دہ جامع مسجد، دہ قطب میار
دہ قبریں جن میں بزرگوں کی خاک دو بول دعا سپنگ کے لیے تو سر رہی ہے۔
فاب کامزار، شیخ اکشاخ نے حضرت نعم الدین اویا، کامر قدیر نور ——————
سب چھے گئے۔ سب اصحاب سے نکل گئے، تم کو مجھے پہنچنے نصیب
میں کتا ہوں، پتھاڑا، ہمارے اپنے ناگفتہ باراٹاں، میں تم کو باتا ہوں
تقدیر اتم کیا ہے؟ —————— پان لاڈ ۔

پان حاضر کیا گی۔

میں تم کو باتا ہوں تقدیر اتم کیا ہے شمشیر و تان اول ٹاؤن زباب آفر

رب المغزیں

” دعست تیرے کی ہے دسکل دال پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرچ رہا
تھا۔ چاند بیان میری تھی نہ جو پر عاشق تھی۔ وہ تیرے سہ پر تھوڑتی بھی نہ
تھی۔ ان ————— ”

دوسرے جوان سوڈے کی بوئیں اور خالی لگاس س جمع کر کے ایک محل سا
جزاب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دو ساتھی ایک دوسرے کے سر پر آنکھ رہے جو سنبھل
شنت فراہم ہے تھے۔ ایک پارس لڑکی ان کی حرکات پر قبیلے کا رفقاء میں
ایک لنیدہ ساتھیم، ایک پیارا سار تعالیٰ پیدا کر رہی تھی۔ اس نے نہاد کے
رذگین بیاسن پناہ رہا تھا۔ اس بینگ کا شیوم میں اس کا چہرہ را جن توں
کی طرح ناہرا تھا ————— بزرگ فراہم ہے تھے ————— پان لاذر

چیت کوڑ اور اسپل ہال کے درمیان جانماگا نہ بھی کا بت پہرے
پر چوکس لکھ رہے کہ کہیں انھات اور سیاست ایک دوسرے کے قریب
نہ آئے پائیں۔ دو سانچل سوار ٹھہر کر اس کا جائزہ لینے لگے۔ ایک نے اس
کی لاثنی چھیننے کی کوشش کی، دوسرے نے اس کی یونگ کو اڑانا چاہا۔ جب

وہ دونوں اس کوشش میں ناکام ہوئے تو ایک نے اپنی ردمی لوپی آنار کربٹ
کے سر پر رکھ دی اور دونوں خوش دہان سے چل دیئے کہ انہوں نے چلکے چلکے
اس بست کو مسلمان کر لیا۔

ایک بندوق خاندان بھرت کر رہا تھا۔ ان کی خوشناکوٹی کے سامنے¹
چار اونٹ کارڈیاں سامان سے لمبی کھڑی ہیں۔ لوبے کے ٹنک چڑے
کے سوت کیس کلڑی کی پیشیاں ————— سامان میں ایک طوٹے کا
چڑھو بھی ہے۔ طوطا مرٹر کی چھیدیاں لکھرا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس سے
گزرتا ہے تو وہ نیم بازا آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھتا ہے گیا کہ
سما ہو کر ورسا لو! میں بھی چلا — اب میں دیکھوں گا تم اپنا پاگستان
کیسے بناتے ہو —————؟

تصیر ہے جوہل کی رقص گاہ میں آرکسٹرا بج رہا ہے۔ جوہل کے میسخرنے
بیچ پر آکے اعلان کی کہ آج رات کی نصفت آمدی تاماً غضمِ ریلیت قمنہ
میں دی جائے گی، لوگوں نے گرم جوشی سے تایاں بجا یں۔

رب المعاين

میراجی کراچی سے اکٹا گیا ہے: ایک دیدہ نزیب بیگ نے شیری کا لخاں
بیلين سے لگا کر کہا: چھوڑ دیج کچھ روز کے لیے بستی گھوم آئیں:
اس کا ساتھی شپین پر رہا تھا یہ اب تو بستی بھی مر جوم ہو گئی بیگم—
ساتی کا نگوس اس پر کسی صغری کو راہب خانہ بنانے پر قلی ہولی ہے، نہ
دھکی، نہ شیری، نہ جن نہ شپین۔ اب سننا ہوں کہ ریس پر بھی بندش
لگانے کی سازش ہو رہی ہے؟

اس سے ہاں: بیگم کو ایکا بھی یاد آیا۔ ابھی الگے روز پر دیسر گھنائم
کا خط آیا تھا۔ پر دیہش کے اتحوں بے چارہ مجبوڑ ہو گیا ہے۔ ایک کس
و سکی مٹگوانی ہے، کسی طرح بھجوادو، دُریڈ ۔۔۔
ایک غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے
مر گوشی کر رہا تھا۔ مجھے کراچی میں دو چیزیں بہت پسند ہیں:

”مجھے تین“ دوسرے سے کہا

”پارسی لودیاں“ اور مسلمان عورتوں کے بر قعے:

”مجھے بر قعے والیاں بھی پسند ہیں“

”واقدہ رہے کو رہا تھا ہو۔ ان مذوق عورتوں کو کون چاہے گا بختا؟“

۱۔ انھیں میں چاہتا ہوں۔ میرے میسح کی قسم مجھے یہ جیسا حسن پستھے ہے۔
پلے پلے گاؤں میں نیلی نیلی رگوں کی لکیریں، اس پر فاز سے کا جار —
خزاں کے موسم میں ٹھنڈب کل پیاس — ہائے میں نے ایسا حسین امداد
کیس نہیں دیکھا — بولتے دد سوڑا دد دلکی ۔۔۔

۲۔ ایک ہی بات ہے تم ٹلاڈیا میں ٹلاڈیا — چار سے
ددنوں ملکوں لا بلند نصب العین شرک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستغل نہ لئے
کی ہر ملن کو شمش کریں گے — تماری صحت کے لیے:
ایک سلمان ایڈیٹر یعنی سکواں سے جی بھارا تھا۔ موقع پاکر وہ
شراب اور پرے کے ایک بڑے تاجر کو گھر کر کھڑا ہو گیا۔

۳۔ میں نے تسلیے کہ پاکستان بننے کے بعد کلامی اور ہجومی دلائی شراب
کی کھپت پلے سے تگنی ہو گئی ہے؟" ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل کے لیے
موار اکٹھا کرنا شروع کیا۔

۴۔ "غلط" تاجر نے اگر محوشی سے تردید کی۔ "باخل غلط، آپ بھی ایس
جیب افواہیں سے اُستے ہیں۔ تگنی تو کیا اگر دگنی بھی ہو جائے تو غصت ہے۔"
انسوں" ایڈیٹر نے اصرار کیا۔ "کیا یہ امر اس تھی اسلامی حکومت

کے لیے شرمناک نہیں؟

۱۔ پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا اور سلسلہ عالم میں سب سے بڑا ہے۔

۲۔ اجرتے ایڈیٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی؛

۳۔ کیا یہ امر اس سب سے بڑے مسلم عالک کے لیے شرمناک نہیں؟

ایڈیٹر صاحب برابر مفتر تھے۔

۴۔ قبلہ "تاج درخانے" دسکی لا لمبا سا گھونٹ جھر کتا۔ آپ بیاست

بنا رہے ہیں۔ مسجد نہیں —————

۵۔ وہ کامے کامے بڑھتے۔ دوسرے غیر محل سیفرا میکڑی پلے فیر
محل سیفرا کے میکڑی سے کہ راتھا۔ "سرخ دم بزرگیم کے سر مرلتے ہوئے
نقاب، بر قلعوں کی اوت میں جان بختے ہوئے گول گول پیٹھ پیٹھے، لال لال
پھر سے، سندھل بانہیں۔ راشم کی قلعوں سے جھلکتے ہوئے مخدوٹی ہاتھ —————
کنواری مریم کی عصمت کی قسم، میں نے ایسے بر قابے

کیں نہیں دیکھے۔ جب میں انھیں الفتن شریث کی دکانوں میں بھیان
گراتے دیکھتا ہوں، یا کامدھی گارڈن کے بزرے پر اٹھلیدیاں کرتے ہوئے
پانما ہوں تو میراجی بے اختیار چاہتا ہے کہ میں ان کے قدموں میں اگر جادوں

یاختا

اور ان کے نازک اور سبک پاؤں مجھے اپنی شوکر دس سے رومند تھے جائیں
رومند تھے جائیں ۔

بوستے دو پگ دسکی اور سوڑا ہے پہنچنے آواز دی ۔

اس بار میری طرف سے بوائے ہے دو سوڑا دو دسکی دوسرا سے
نے کہ ۔

”ایک ہی بات ہے تم ٹلاؤ یا میں ٹلاوں ۔ ہمارے ہمارے طکون کا
نصب العین ایک ہی ہے جم پاکستان کے خانہ بدوش مهاجرین کی میں
مذکوری گے ۔“

”یہ دو تی کھوٹی ہے جی ہے بس کے کندہ کردنے کر خلی سے کما
اسے بدال دد ۔“

یہ دو تی میں نے نہیں بنائی ۔ پنجابی پسخرنے ترکی ہے ترکی جواب دیا
میں ج دو تی کوئی دلی یا لکھنؤ سے نہیں لایا میں تمہیں ہرگز دوسری دو تی
نہ دوں گا ۔“

کندہ کردنے میں روک دی ۔ جب تک تم مجھے دوسری دو تی نہ دو گے

یہ بس آگے شیں جائے گی؟

کچھ خجا بیوں نے کند کمر کو چند فصیح دلیغ کایاں دیں۔ ”ساتھے سندھی،
معت کا پاکستان مل گیا سالوں کو، ہم بھی دو دن میں مزاج تھکانے لگا دیں
گے، ہاں۔“

کند کمر اور ڈنائیور باہر مخل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے، ”ساتھے
پنجابی پٹ پاکر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں تھا۔ سر پر ہی چڑھے
آتے ہیں، سور کے بچے، جیسے ان کی ماں کے خصم کا گھر ہے یا ہاں۔“
ایک ہندو راہ گیریہ قصیدہ سن کر ہمہ گلیا اور داد کے ٹور پر اس نے
کند کمر اور ڈنائیور کو ایک ایک بڑی پیش کی۔

دوسرا بھائی یہ ہنگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آئے۔

”لارنس ردو لستی روڈ ہے جی؟ ایک نے پوچھا
”یہی کوئی دو فرلا ہگ اور ہوگی۔“ دوسرا نے اہناء نگایا۔

”آڈ ٹھلتے ہی چلیں۔“

یہ سب دو دوں بس سے ایک محفوظ قاصدے پر منج گئے تو انہوں نے
ردی دلتے حادثہ پر جی کھول کر تبصرہ لیا۔ ”لٹنے والے“ ساتھے سندھیوں

یاختا

اور چاہیوں کو کہتے ہیں پاکستان کی زبان اردو ہوگی، چھی، گویا شرف نہ گلا
بھاشا ہماری قومی زبان ہی نہیں... چھی

عمر لے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا، ایک چاہرہ دلے پر گرج
راتھا۔ تم یہ گندے کیسے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں لمبیاں
آئیں — ان ۴

لبے چل، ہوٹل کے بچے، چاہرہ دل والا اکڑ راتھا۔ یہ پرڈی تیرے
پاراگی ہے؟

ایرانی نژاد ہوٹل دلے نے پاؤں کی ایک بھروسہ خود کے سے کیلوں کی
چاہنی اٹھ دی۔ چاہرہ دل والا پاک کراس کی ٹانگوں سے چھٹ گی۔
ایک لانیبل نے اکڑ چاہرہ دلے کے منہ پر زور کا تھہڑا راہا۔ ساکے
حراہی کھن بار کہا ہے، یہاں بھری مت کردیں سننے ہی نہیں حرامزادے
چلو، تھانے چلو!

چاہرہ دلے نے گزرا کر خوشامد کی، کردار و فرجی، میں احیر شریعت
سے آیا ہوں، میرا گھر بار سب رُٹ گیا ہے۔ میری آنہ میں میرے ماتھ

ہے۔ بھے چھوٹ دو۔ میں پھر سیاں چھاپڑی نہیں لگادیں گا۔
 لیکن تافون تافون ہے۔ تافون کی نظر میں نہ ابھیری کا امیانہ ہے
 نہ لاہوری کا۔ نہ اندھی بہن کی قیز ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کانٹیل نے اپنا
 فرض منصبی بڑے آسٹن طور پر انعام دیا اور چھاپڑی والے کو اسے لگا کر
 تھامنے لے گی۔ — جب تائیدار نے اندھی بہن کی تفصیل
 سنی تو اسے کانٹیل کی نالائقی پر بڑا غصہ آیا کہ لیوں نہ وہ اس کی اندھی بہن
 کو بھی ساتھی بنتا آیا —

دو اور دوچار — چار اور قین سات — سات
 اور فرکے ہوئے؛ چیلارام دلال نے خوشی محمد دلال سے پڑھا
 خوشی محمد دلال چلتے سے سمجھی تکال کر چھپڑی پڑھک راتھا۔ اونہ مری
 سمجھی کو فرش پر گرا کے اس نے چلتے کا ایک بیسا مگزٹ بھرا۔
 سات اور نو سولہ چیلارام نے خود ہی حساب لگایا۔ "میں نے کی
 "استاد" میزرن بُرانیں رہا۔"
 خوشی محمد دلال نے اپنا لگا جوا نچلا ہوت سیست کر چلتے کا ایک اور

بیسا سا گھرنٹ دیا۔

”پس پوچھو دوست تو بڑا اگر اہ سیز ن لگا تھا۔“ چیلارام کے کاروں کی پکوریاں خوشی سے پچھوں رہی تھیں: ایک سیز میں سول چھوڑ کر یاں! امام قسم میں نے تو ایسا دھندا ساری گھرنٹیں لیا تھا!

ایمناں قلب کے انہمار کے طور پر چیلارام نے چاند تار سے وائی جناح کی پ آوار کراپنی بھی چندیا کو روڈر ندر سے سلا لیا۔

خوشی محمد کا مکا ہوا پنجاب جو نت اور بھی ٹیک گی۔ اور بدھمل کے طور پر اس نے چائے کا ایک طویل سا گھرنٹ سڑاپ دیا۔

”تم سا سے تمہت کے دھنی ہو،“ خوشی محمد منہنا یا۔ ”چھوڑ کری پوچھو کری آنادتے تھے، یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں۔“

”تین چھوڑ کر یاں! تھوڑا!“ چیلارام نے غذا ریسٹوران کے فرش پر جنم کا ایک بڑا ساغھہ تحرک دیا: کافی کافی پر بنیں۔ کوئی ملکھا اٹھا کر بھی: دیکھنا تھا تھوڑا۔ میرے پاس بڑھ سے انمول دانے تھے، یا... گرم گرم سخت سخت پنجابیں۔ نازک ٹکدار دنی دیالیاں اور پھر دہ پٹیاں سے والی جنینی، ہٹلے نئے میرا تھی، خوشی محمد میرا!“

نہب العالمین

چیلارام نے ایک خارا بکٹِ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ دالا۔
 دو سالا براون اسے پورٹ سید سے گیا۔ لکھا تھا: بڑا کام دے گی
 داں ————— میں نے کہا خوشی محمد یہ پورٹ سید کس طرف ہے؟
 جوگی لیں: خوشی محمد لا بیو پار فرما مندا تھا: چاہتے نگواہ اب تو کوئی
 سالی رفیعی گرین بھی نہیں آتی:

گرم چاہتے لے دوسرے کپ پر وہ دو توں پھر اپنے اپنے چاہوں کی
 دنیا میں بھر گئے۔ چیلارام دلآل اپنے انہوں دلوں کا حساب لگادا تھا۔ بڑ
 اس کے اپنے انہوں سے نکل کر رہتے زمین کے مختلف حصوں میں بھرے
 ہوئے تھے۔ قاہرہ ——— لندن ——— پورٹ سید ———
 نہ جانتے اس کے بیش تھیت تھنخے کس کی شبستان کی زینت ہے ہوتے تھے
 کسی دمکدار آرامگاہ میں اس پڑیاے وال جنپی کا جسم بھی ریشم اور کھواب کے
 گاؤں پیکنے کی طرح سجا ہوا ہو گا۔ ——— چیلارام کے دل میں عجیب
 عجیب قسم کی آرزویں سراٹھا رہی تھیں۔ ایک بار اس کا بھی چاہا، کہ وہ پر
 لگا کر پورٹ سید جا پہنچے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ ملے جائیں
 کے مت پر اس کے پڑیاے کی جنپی کو واپس لے کے اور اس کے لگتے ہوئے

کھلیں گا تو سمجھئے ایسے جسم کو بانوں پر اٹھا کر بھاگ آتے، بلوخانوں سے
لڑتا ہوا، سمندر کی مہدوں سے مکارا تباہ ہوا۔ پہاڑوں کی چھاتی کو پھر تباہ ہوا۔ —
خوشنی محمد دلال کی دنیا میں فلم اور سمعت کا دعوانامہ بھایا ہوا تھا۔ پہلے تو
یہ سامنے ریپوورٹ ہوا تھا جبازوں میں بھر بھر کر ہستے چاہتے تھے۔ ٹرینوں پر
ٹرینیں لدی آتی تھیں۔ — لیکن اب کچھ دنوں سے بازار میں وہ
ہر روز انجار دن میں نئی نئی خبریں پڑھتا تھا۔ — دنی میں خون —
کافپور میں خون — لکھتے میں خون — — احمد آباد میں
خون — — اجیر میں خون — — لیکن، سامنے خون
لئے سیلے میں ایک ریپوورٹ رین بھی کراچی نہ پہنچتی تھی۔ خوشنی محمد دلال کو اس
بات کا سخت قلمی تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موہوم سی امید کا سہماہ اسے کر
چکھ پھیسے کا خون کیا اور انجار کی جملی سرخیوں پر بھائی جوئی لغزدگانی انجار
بیچنے والا چھوڑ کر الخاچاڑ پھاڑ کر بیچ رہا تھا۔ اب تو کشیر میں بھی بھر گئی
— جگون میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا۔ — اب تو —
خوشنی محمد دلال سندھ ہرگز شرق ہو کر خبریں پڑھیں۔ کشیر کی جنت میں بھی
ددرنگ کے شنے بھڑک رہتے تھے۔ رعنگان کے کھیتوں پر آگ ہر سو بھی تھی۔

رب العالمين

پوری کے دامن میں شریعت سے تھے۔ سیم بارہ کی جلد ڈگر دن کی تواریخ
پل رہی تھی۔ ہزار دن مر گئے تھے، ہزار دن مر رہے تھے۔ ہزار دن مینڈ کوں کی
درج چبپ چبپ کر، چوڑوں کی فوج بیٹک رینگ کراس آشکدہ جنم سے
باہر نکلنے کی بوشنش کر رہے تھے۔

خوشی محمد نے چیلارام کی ران پر زور سے اتھر مارا۔ اب تو کشیر میں
بھی لگی، میر سے یاری میں تھے کہا، چیلارام، دوسری تو۔
چیلارام پورث سعید کے تصور میں تھا۔ پھر تو سب نہیں بوجائیں
گے؟ اُس نے بے ترجی سے پوچھا۔

یکن خوشی محمد میں شاعری کی روح حلول کر لئی تھی۔ اس نے چٹخا سے
لے کر کشیری نازک بدن، سیم تن عورتوں کا ذکر شایا۔ خوبصورت
زیگین، الحفدر، عریمیں —————— ہن کے ہوں میں سب ہوتے
ہیں۔ پھاتی پر ناسٹھا تیاں۔ ہونتوں پر الخوار کامیں۔ انجموں میں ڈل کی
ہر دل پر قصنه کنڈل۔ لگنے میں ہماری بھروسوں کا سروود۔ اُمگ اُمگ میں
لھاپ اور مویتے کی زنگت۔ زغمزان کی بھیتی بھینی رنگ ——————
چیلارام دال کے منہ سے دال ملکتے تھی۔ دہ لمحیں مل کر انٹو بیٹھا در

خوشِ محمد لکھے یئے اس نے چائے کا تیرا کپ بھی منگوا یا۔ پھر وہ مز سے صریح
کر بیٹھ گئے اور کشیر کے سیزن کی ایمڈا فزار علایتیوں میں بھوگئے ۔

ہوا کے تھیڑوں سے باد باس مرا یا۔ موجوں میں ایک ہلاکا ساقِ قلم اٹھا ۔
کشتی ڈالنگا تی اور وہ ستم کر سیٹھ تا تم علی دامِ علی کے پلستے لگ گئی ۔
سیٹھ تا تم علی دامِ علی کی تو ندیں نہیں کا جوار بجا نا سا اٹھا اور پان کی پلیں
جو کچھ عرصہ سے اُس کے منہ میں جمع ہو رہی تھی بے اختیار بُر د کے گند سے
پانی کی طرح بہ نگلی ۔

بُر رُحاء طاح بُری سلکا کر مسکرا یا۔ کشیر سے آئی ہے سیٹھ، اندھی ہے
پکاری ابھی درتی ہے، بُوو، کس ٹرف چلوں؟ پیرس یا دنیس؟

سیٹھ تا تم علی دامِ علی کا ایک دفتر پیرس میں بھی تھا۔ یوں بھی اس نے
پیرس کے متعلق بڑی دلادیز باتیں سن رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس پھولوں
سی ڈالنگا تی ہوئی کشتی میں اتنے بلے سفر پر چلنے لے لیے ہو گز تیار نہیں تھا
چنانچہ جب طاح نے اسے پیرس یا دنیس چھٹے کی دولت دی تو وہ بوكھلا گیا ۔
چالاک طاح اس کی بوكھلا ہست پر مسکرا یا۔ گھرا دنیں سیٹھ، دُور نہیں

سے جادوں گاہ : کیا جلد بھے پریس بھی ! دیکھو گے تو مر جادے گے ॥ ۲ ॥
 لیکھاری کی بندراگاہ میں خاصی سلسلہ سیل تھی۔ اوار کی چھٹی ننانے والے ہجوم اور
 اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی منور اجارہ تھا، کوئی سینڈپٹ آتی یہاں ۔ ۔ ۔
 اور ایک جہاز بمبی جانے کے لیے ٹکڑا اٹھا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں
 زخمیں سارے یہاں پھر پھڑا رہی تھیں۔ لوگ درینیں انھوں سے لگائے
 کرایاں کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہوا، تو کچھ لوگوں نے
 اپنے ہر دن سے جناح فوپیاں آماز کر سمندر میں پُنج دنیں اور ہوا میں لگھونے کے
 لہرا کر رہے ہے۔ کانغرہ لگایا۔

کشیری اندھی دو شیزہ سیٹھ قائم علی دام مل کے پلو سے ملی ایک لگری سچ
 میں ڈریں ہوتی تھی۔ جب ہر دن کے کلام پر کشتی کا سینہ ڈال گا کہا تو اسے اپنا بکا
 پھکالا شکا نا یاد آتا، بسا سی طرح ڈل اور ودر کی نازک ہر دن پر قصر قرار اکیرا
 تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلوجھ بھر پانی پیا تو اسے تے آگئی ۔ ۔ ۔
 — اُت : اکتا کرو اپانی تھا۔ ڈل کا پانی تو تکارہ دودھ کی طرح میٹھا تھا اور
 پشتر شابی کا پانی۔ لائے جیسے دودھ اور سکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے
 وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کو دی جیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کا لاء ہے یا نہ ؟

یادا

نیلا ہے یا بزرہ یہیں اسے اس کی آنکھیں؟ ایک دن تھا کہ اس کی خلافی آنکھوں میں جھیل دوسری نعیت نیلا ہے اور پکے بارا مروں کی نازک راحت ہوا کرتی تھی یہیں اب ان کی جڑ لگرے گئے رخت تھے۔ جیسے دو اندھے اور تاریک کمزیں کسی دوسرے دراز ویراستے میں لکھوتے پڑتے ہوں — اب وہ اندر چھی بے بصر تھی ایک پھادر ڈو گرنے پنی شگین سے اس کی آنکھوں میں بیٹے ہوئے دسیں تک محلا بھاکر کر دتتے، سائل کے ہنگامے سے دُدھ ایک لامے رنگ لا جماز سندر میں تناکھڑا اتحا اس پر سُرخ دنگ کے جل عروت میں لکھا تھا کہ اس میں بارہ دہے ہے۔ جب اس کی کشتی پاس سے لگزدی تو سیٹھ تام علی دالم علی نے جلدی سے رُنگ کا انحر چھوڑ دیا۔ معاٹے ذریگا کر کیں یہ بارہ دیجک سے اڑنے جاتے — جب کشتی ذرا دُور نکل گئی تو سیٹھ تام علی دالم علی نے پھر اس کے دلفون اکتوپر گراپی قوند پر رکھ دیے۔ کشتی ایک چھوٹے سے جو دیس سے جاتی ہے جو دیس میں چند ماہی گیر دل کی چھوٹ پڑاں تھیں۔ ملاح نے بتایا کہ اس عترت کم سے کامن پریس ہے اس اپنے اور بھی چند جزوی سے تھے، ان کے سالہوں پر بھی اکا دکا کشتیاں بھڑکتی تھیں۔

کہیں دیس تھا، کہیں نیپلز — کہیں ردم —

ملاح نے بادبان لکھوں کر کشتی پر ایک سائیان ساقی دیا۔ پھر اس نے سیچ

رب العالمين

تم میں دامِ علی کو آنکھوں ماری ۔ ” رو سیمینڈ ہیں تو پھر لیاں پڑھنے چلا ۔ تم
مزسے سے کشیر کی باریں رو ۔

عیدِ گواہ کے میدان میں ایک میتا بازار لگا ہوا ہے۔ جیاں ہر روز عید ہے
ہر شب شب برات اٹھات کی چھوٹی چھوٹی جھوٹپڑیوں میں نشخے نشخے چراغ
ٹھہرا رہے ہیں۔ گوشت روڈ بیٹے ہوئے کپڑے، پرانے بوٹ تمازے پہل بوبہ
کی میغین، نکڑی کے صندوق، چہڑے کی کرسیاں، یتل، اچار، صابن ۔۔۔ بے گھر
اور بے در حاجر سارے کی ہر مکان لڑدی تھام کر جیتھے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب
قلم کا الیمان ایک عجیب قلم کی ابہیت اس ماحول پر جا رہی دھماکی ہے۔
بجھے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ نہ مگی کا یہ مجھ کا ہوا کار داں، آخر اپنی منزل متصوڑ
پر پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کر دستھے کیے ہوئے ہیں۔ سانتے کی طرف شاد
پکوڑیاں تالیں ہی ہے۔ پچھلی طرف زبده دھی بڑے لگتے بیٹھی ہے۔
ایک مبارکہ نگاہ پر چھان پکوڑیوں کے سامنے پھسل کر امداد سے بیٹھا ہے۔
” گرم لرم پکوڑیاں جس خان لے گاون ۔۔۔ بدوستنے کی دوں ۔۔۔ ”

زرم ہے، تو، گرم ہے؟ پھان نے آنکھ ماری۔

ہاں خان! زرم ہے، خرگرم ہے؟ دشاد کوچی منے کے سامنے کر کے ملکائی دشاد کی مکراہست میں بھی عجیب جادو تھا۔ اس کی ایک مکراہست پر خمار ہو کر حیم خان نے قسم کیا تھی کہ اگر سورج یا چاند یا مارے بھی اُسے اٹھائے جائیں تو وہ ارض دھماکی دستیں چاند کر رئے چین لاتے گا۔

پھان نے ہر نڑوں پر زبان پھیری۔ "خو ایک روپیہ؟"

"نہیں خان، خو پانچ روپیہ۔"

"ہمٹ، خر، دھانی روپیہ؟"

"خو پانچ۔"

پھان نے اپنی بھیب کے پیے گئے۔ اس کے پاس تین روپے چار لئے تھے اس نے پہنچے دو روپے کا ادھار لانا چاہا۔ لیکن دشاد نے اُسے مجور کر دیا کہ خان، قرض جبٹ کی قیمتی ہے تھی میں پورے کر لاؤ۔ میں تمہیں جبٹ پٹ زرم ٹرم، گرم گرم لکھوڑیاں آتا رہ دوں گی!

پھان مایوس ہو گر دوسری طرف چلا گیا۔ ہاں اس نے دھی بڑوں کا سودا کیا۔ زمیدہ ابھی بچھتھی، نادان تھی اعتموم تھی! اس بیٹے وہ پہنچے وور دپے کا ادھار

مان گئی۔

زبیدہ نے دشاد کو آواز دی۔ تین ذرا اس طرف دیمان رکھنا محدود سو
رہا ہے۔ میں ذرا خان کے ساتھ جا کر دی یہے آؤں۔

اسی طرح جب دشاد بھی اپنی پکوڑیوں کے لیے میں یعنی کسی ٹاہک
کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی کو زبیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔ دی ہی اور میں
کی اکس خلاصت پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مت کا مستقبل پر دان
چڑھ رہا ہے۔ جب دشاد کی بچی نرم گرم گرم پکوڑیوں پر مل کر
جو ان ہوگی۔ جب زبیدہ کا محمد دی ہی بُون کی چاٹ پر سیانا ہو گا، تو
اسلام کی باد رہی میں دھڑکنے کا انتہا ہو جائے گا۔ ایک ضرب
بھائی، ایک خوبصورت میں ————— سبھم کی مضبوطی پا در سبھم کی
خوبصورتی! یہی تروہہ اینٹ اولگا رہے۔ جس سے باد رومیں تعیسر
ہوتی ہیں ————— سبھم کی مضبوطی اور سبھم کی خوبصورتی!
یہی تروہہ تعیت عظیٰ ہے، جو غصتوں والے عظمسوں والے باری تعالیٰ
نے تم کو عطا کی ہے۔ وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیعیں آتا ہے۔ دی ہی مشرق کا

یا خدا

مالک ہے، وہی مغرب کا مولا ہے۔ اُسی نے درختوں پر فرسے اور اندر
نگائے۔ وہی دریاؤں سے موئی اور موئی نگائاتا ہے۔ وہی جنت کا
رہائش ہے، وہی دوسرخ کا قمار ہے ————— پھر تم لپٹ پر ودگار
کی کس نعمت کو جھیلادا ڈالے؟